آوارہ گرد

قسط:40

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

PkPdf.Blogspot.Com

مندر کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر، سنسنی اور ایکشن سے بھرپور تاڈو بستار کا دلچسپ سلسلہ...

PkPdf.Blogspot.Com

PkPdf.Blogspot.Com

PkPdf.Blogspot.Com

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کمبل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ کمبل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ ریگنبرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولووش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولووش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولووش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نووولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولووش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو تلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو تلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کمبل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کمبل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولووش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری یوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جوڈرو سے برآمد ہونے والے طلسمِ نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولووش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی یوٹ میں بلیو تلسی کے چندر ناتھ، شیام اور کورئیلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیو تلسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو تلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں..... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور اس نے غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیرِ اثر تھا کہ رینا کا سیل فون بج اٹھتا ہے۔ کال سنتے ہی رینا خوف زدہ نگاہوں سے شہزی کی طرف دیکھتی ہے اور قریب کھڑے بلراج سنگھ سے چلا کر کہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ پھر جیسے بل کے پل کا کلپ ہوجاتی ہے۔ مگر شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کر لیتا ہے اور رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو تلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو تلسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے۔

PkPdf.Blogspot.Com

ل جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی ے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کیپٹن دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کورئیلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو لی منجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ات ناناشکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ ناناشکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور ناناشکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف انہ ہو جاتا ہے۔ ناناشکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چمائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے وں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ ناناشکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے پیر میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہو جاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی رنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے ناناشکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو تا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کورئیلا اور سے جی کوہارا سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ غیبی مدد کے طور پر اڑدھے کورئیلا اور سے جی ہارا کے رستے میں آ جاتے ہیں۔ شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کوہارا کی جیپ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں گاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کر سکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے مان خطا ہو جاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ں ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور وں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ کچھ نہیں تی تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں بری مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی سب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم بری مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ مان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر ن میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ وہیں لنگڑے ی کے بھیس میں کیپٹن دادا اس کے سامنے آ جاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔ کیپٹن دادا کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ممبئی ائرپورٹ پر بھارتی ایجنسی کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد ان تینوں کو بیلو تلسی کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں سے سی جی بھجوانی انہیں انڈر ورلڈ ڈان بھولا ناتھ کے نجی قید ڈیول کیمپ بھیج دیتا ہے، وہاں کا ایک قیدی بدمعاش داور شکیلہ پر نظر رکھتا ہے منصوبہ بندی کے تحت شکیلہ داور کو جھانسے میں لے لیتی ہے اور ہمارا کام آسان ہو ہے۔ داور کو قابو کر کے قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے کہ اچانک ہی دھماکے ہوتے ہیں اور ہر طرف گیس بھر جاتی ہے اور پھر ہمیں کچھ ہوش نہ رہا۔ میں آئے تو خود کو زنجیروں میں بندھا پایا۔ ایک بیگار کیمپ تھا، جس کی کمانڈ بلراج سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور نے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی ین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ ا سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کر کے ... ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر مقامی ں کی سرزمین اور ڈارک کیسل ان کے حوالے کر کے ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے ہ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام چھلگری کی بیوہ ارم سے ملتا وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر ال خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغواء کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کیپٹن دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو ال خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ شاہ نواز کے حواری شکیلہ اور ارم کو بھی پکڑ لاتے ہیں۔ شہزی کو رسن بستہ چھوڑ کر شاہ نواز، شکیلہ کو ساتھ لے کر ہیر ے لی میں نکلتا ہے جو شکیلہ نے قبرستان میں کہیں چھپا دیا تھا۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز اسونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں الش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو ہے۔ عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے ہوش کر کے ایک گہرے گڑھے میں ال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کر دیں گے۔ شہزی، عارب کو ساتھ لے ل کو بچانے نکل پڑتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ آواز غراہٹ سے مشابہ تھی.....

میں ابھی اس کی سمت کا اندازہ ہی کرتا رہ گیا تھا جبکہ پ فوراً ہی خطرے کی بُو سونگھ کر بولا۔

"ہوشیار! حیوانی شکاریوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔"

اس کا لہجہ لرزیدہ سا تھا۔

"کک..... کس طرف.....؟" میرے منہ سے قدرے ہکلاہٹ آمیز الفاظ برآمد ہوئے۔ میں ہنوز غراہٹ سے مشابہ اس آواز کی طرف دیکھنے کی کوشش کر رہا

PkPdf.Blogspot.Com

تھا اور عارب کے بتانے سے پہلے ہی میری متلاشی نظروں نے مذکورہ سمت میں ایک .... بھورے رنگ کے کتے کو دیکھ لیا تھا۔ وہ ہم سے صرف چند فرلانگ کی دوری پر ایک ریتیلی مٹی پر بیٹھا ہماری طرف گھور رہا تھا۔ اس کے خونخوار سا تاثر پیش کرنے والے جبڑوں سے دو نکیلے شکاری دانت جھانک رہے تھے۔ میں نے فوراً گن سیدھی کرلی۔

''خبردار! ایسی کوئی حرکت مت کرنا۔'' عارب نے سرسراتی آواز میں مجھے متنبہ کیا۔

''گن نیچے جھکالو.....'' میں نے ایسا ہی کیا۔ عارب نے مجھے دائیں جانب سے آگے بڑھنے کو کہا۔

''یہ رات کے راہی ہیں مگر چوکیداری کے لیے ان میں سے دو تین کتّے جاگتے رہتے ہیں۔'' اس نے میرے ساتھ آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ بھونک بھونک کر اپنے ساتھیوں کو جگادے گا۔''

''مگر اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ وہ ہمارا پیچھا کہاں چھوڑے گا؟'' میں نے کسی خیال کے تحت عارب سے کہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگے چلتا ہوا نسبتاً ایک اونچی ٹیکری کی اوٹ میں آکر رک گیا۔

ہمارے سروں پر سورج مسلسل آگ برسا رہا تھا۔ گرمی اور تپش کی شدت سے میرا دماغ گھومنے لگا تھا۔ پسینہ.....ٹپ.....ٹپ..... بہہ رہا تھا۔ پیاس کی شدت سے حلق خشک ہو چکا تھا۔ آواز بھی اٹک اٹک کر برآمد ہو رہی تھی۔ سچی بات تھی کہ اس خوفناک جہنم زار بنجر ویرانے میں مجھے پریل چانڈیو کے زندہ بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ میں خود کو اب کوسنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ میں یہاں آیا ہی کیوں تھا؟ یہ کیسے ممکن ہوسکتا تھا کہ کسی شخص کو رات میں ایک ایسی کھائی میں پھینک دیا جائے جو خونخوار کتّوں اور لگڑ بھگوں کا مسکن تھی، ایک بے ہوش شخص ان کے خونی پنجوں سے بچ سکتا ہو.....؟ بس! ایک خوش امیدی تھی یا پھر اسے ایک سرپھری سی دھن سمجھ لیں کہ میں نے پریل چانڈیو کو تلاش کرنے کی ٹھان لی تھی۔ شاید اس میں سونہڑیں سے کیے گئے وعدے کا دخل تھا اور خود پریل کا میرے ساتھ وہ دوستانہ سلوک بھی جو اس نے میرے ساتھ روا رکھا تھا۔ میری یہ سرشت نہ تھی کہ ایک بار کوئی میرے ساتھ دوستی کا دم بھرے اور میں کسی آڑے وقت میں اس کی طرف سے منہ موڑ لوں.....بس! شاید یہی وہ عزم تھا جو مجھے اس پُرخطر جگہ پر لے آیا تھا۔

ٹیکری میں آنے کے باعث وہ بھیڑیے سے مشابہ کتّا ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ عارب بھی میری آنکھوں کے سامنے اوجھل ہو چکا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا شاید وہ اِدھر اُدھر کہیں ہو گیا ہے لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ تب ہی ایک لرزتا ہوا خیال میرے دل میں ابھرا۔ کہیں وہ مجھے یہاں مرنے کے لیے چھوڑ کر خود راہِ فرار تو نہیں اختیار کر گیا تھا؟ یہ سوچتے ہی عارب کی اس دھوکے بازی پر میرا دماغ جو پہلے ہی گرمی کی شدت سے گھوما ہوا تھا، آتش فشاں بن گیا۔ میں ٹیکری سے ہٹا اور اسے آوازیں دینے لگا۔ میں ٹیکری پر چڑھ گیا کہ اسے دیکھ سکوں۔ اچانک ہی میری نظر ایک جانب پڑی اور بے اختیار میرے منہ سے ایک گہری سانس نکل گئی۔ عارب خان دم دبا کر ایک طرف کو دوڑے جا رہا تھا۔ میں چاہتا تو ادھر سے ہی اس پر گولیاں برسا سکتا تھا مگر میں نے کسی خطرے کے باعث ایسا نہیں کیا، لیکن دوسرے ہی لمحے میرے رگ و پے میں جیسے لرزہ طاری ہو گیا۔ عارب مجھ سے تو بچ کر بھاگ نکلا تھا لیکن اس کتّے کی نظروں میں آگیا تھا جو ہمیں ایک دوسرے قریبی ٹیلے پر بیٹھا ہوا نظر آیا تھا۔ وہ بھونکتا اور غراتا ہوا اس کی طرف گولی کی طرح بڑھا تھا۔ ابھی یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا کہ میں نے دیکھا ایک دو اور ٹیلوں کے عقب سے تین چار کتّے بھی بھونکتے ہوئے اس کی جانب کو لپکے تھے اور آن کی آن میں اس کے سر پر پہنچ گئے۔

عارب خان عبرت ناک موت کے خوف سے بری طرح بوکھلا گیا تھا اور کبھی اِدھر بھاگتا تو کبھی اُدھر..... تب ہی اس کے سامنے سے بھی خونخوار کتوں کا ایک اور غول اس کی طرف لپکا اور اس پر جھپٹ پڑا۔ وہ مدد کے لیے چیخنے لگا۔ خونخوار کتے اسے بری طرح بھنبھوڑنے لگے۔ میں ٹیکری کی آڑ سے یہ خوفناک منظر دیکھ رہا تھا اور میرے پورے جسم میں بھی سرد پھریری سی دوڑ گئی تھی۔ میں اس کی مدد نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے اس ویرانے میں مجھے دھوکا دے کر بھاگ جانے کی فاش غلطی کی تھی اور اب اپنے عبرت ناک انجام سے دوچار ہوا تھا۔ میری پھٹی پھٹی آنکھوں نے دیکھا..... کُتّے عارب خان کو چیر پھاڑنے میں مصروف تھے۔ ایک نے اس کا نرخرہ چبا کر اس زور سے پھاڑ ڈالا کہ سرخ سرخ سی موٹی نالی ادھیڑے ہوئے نرخرے سے نکال کر کھینچ لے گیا تھا۔

یہ خوفناک منظر دیکھ کر میرا پورا وجود جھرجھرا سا گیا تھا۔ عارب خان کی چیخیں معدوم ہو چکی تھیں۔ دیگر کتے بھی

PkPdf.Blogspot.Com

اسی طرف آن وارد ہوئے تھے، ان میں لگڑ بھگوں کا غول بھی شامل ہونے لگا تو کتّے ان سے جا بھڑے۔ اچھی خاصی لڑائی شروع ہوگئی۔ یہی وہ وقت تھا جب میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ عارب خان نے مجھے اس کھائی کی نشاندہی کردی تھی جہاں اس نے اپنے ساتھی کی مدد سے اسے دھوکے سے بے ہوش کر کے پھینکا تھا، لہٰذا میں اگلا ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اسی طرف کو تیزی سے لپکا۔

میرے ہاتھ میں گن دبی ہوئی تھی اور میں ٹیکریوں کی آڑ لیے ہوئے بالآخر اس کھائی کی طرف آ گیا مگر اچانک مجھے ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ مذکورہ کھائی کے قریب ہی مجھے کسی چھوٹی گاڑی کا ملبا سا نظر آیا غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک ہائی روف تھی۔ اس کے ناکارہ ٹائر ریت نما مٹی والی زمین میں دھنسے ہوئے تھے، جس کے باعث وہ ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی۔ شیشے سلامت تھے۔ مگر اگلے ایک اور پچھلے دونوں ٹائروں کی حالت نہایت خستہ تھی۔ باڈی بھی ٹیڑھی میڑھی ہو چکی تھی۔ اس ''کیری'' نما چھوٹی سی گاڑی کی مجموعی خستہ حالی کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ کئی روز سے یہاں اس بنجر ویرانے میں پڑی ہوئی تھی یا تو اس کے سوار گاڑی کی خرابی دور نہیں کر پائے تھے اور پیدل ہی کہیں نکل گئے تھے یا پھر ان شکاری کتوں کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ کیونکہ اس کی باڈی پر ہی نہیں بلکہ اس کے بند شیشوں پر بھی گرد و غبار کی موٹی تہ جمی نظر آ رہی تھی۔

میں ابھی اس طرف قدم بڑھانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک عقب سے.... مجھے ایک خوفناک غراہٹ کی آواز سنائی دی۔ میں بری طرح ٹھٹک کر پلٹا تو جیسے میری روح ہی فنا ہونے لگی۔ میرے پیچھے ایک قریبی ٹیکری پر دو خوفناک جبڑوں والے کتے کھڑے میری طرف دیکھ کر غرغرا رہے تھے۔ ان کی باچھوں سے لمبے نکیلے دانت صاف نظر آ رہے تھے اور ان کے تھوتھنے خون آلودہ تھے۔

بدقسمت عارب خان کی ضیافت اُڑانے کے بعد اب یہ میری ضیافت اُڑانے آئے تھے۔ میرے پاس گن تھی۔ میں گولیاں برسا کر دونوں کو ڈھیر کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے بعد دیگر کتوں کا غول میرے پیچھے لگ جاتا۔ نجانے کس طرح یہ میری بُو سونگھتے ہوئے یہاں آن دھمکے تھے۔ میں دونوں ہاتھ پھیلائے ان کی جانب تکتا رہا۔ میرے ایک ہاتھ میں گن تھی۔ دوسرا خالی تھا۔ کتّے میری جانب بڑی خونخوار نظروں سے گھورے جا رہے تھے۔ میں بھی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا۔ میرا دل بری طرح دھڑ دھڑا رہا تھا۔

یہ مجھے چھوڑنے کے موڈ میں بالکل بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایک شکار کے بچے ادھیڑنے کے بعد انہیں فوراً ہی میری صورت میں دوسرا شکار میسّر آ گیا تھا، یہ بھلا اسے کہاں چھوڑتے؟ میں نے آہستہ آہستہ پیچھے کی جانب سرکنا شروع کر دیا۔ کتوں نے زور سے غراہٹ بلند کی۔ ان کی زبانیں، نکیلے دانتوں سے باہر کو نکلی لپلپا رہی تھیں اور وہ مجھے بھنبھوڑ ڈالنے کے فل موڈ میں نظر آ رہے تھے۔ پھر انہوں نے ایک دم ایک ساتھ میری طرف دوڑ لگائی۔ میں بھی ان کے خوفناک عزائم کا اندازہ کر کے دوڑ پڑا۔ میرا رخ اسی خستہ حال گاڑی کی طرف تھا۔ اس کے علاوہ مجھے اور کوئی وہاں ایسی جگہ دکھائی نہیں دی تھی جہاں گھس کر میں اپنی جان بچا سکتا، اگرچہ یہ بھی کچھ ایسی خاص جگہ تو نہ تھی، بس! ڈوبتے کو تنکے کا سہارا والی بات تھی۔ تاہم سوچ رکھا تھا میں نے کہ ضرورت پڑی تو میں.... دونوں کتوں کو گولی مار دینے سے بھی بالکل دریغ نہیں کروں گا۔ پھر جو ہو دیکھا جائے گا۔ غنیمت تھا کچھ کہ دونوں کتے بھونک نہیں رہے تھے، غراتے ہوئے میرے تعاقب میں اندھا دھند دوڑے چلے آ رہے تھے، جیسے مجھے چیر پھاڑ ڈالنے کے لیے بے چین ہوں..... میرا اور ان کا درمیانی فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ گاڑی بھی قریب تھی۔ دونوں کتے بھی میرے قریب پہنچنے لگے تھے۔

بالآخر جیسے ہی میں گاڑی کے قریب پہنچا اور جلدی سے ہانپتے ہوئے ایک دروازہ کھولنے کی سعی چاہی تو دھک سے رہ گیا۔ وہ پھنس کر بند ہو چکا تھا۔ میں زور آزمائی کرتا رہ گیا۔

PakDigestNovels.Blogspot.Com

یہاں مجھے چند قدموں کے فاصلے پر ایک دو انسانی پنجر بھی پڑے دکھائی دیے، جنہیں دیکھ کر میرے رگ و پے میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ پہلا خیال یہی ذہن میں ابھرا تھا کہ کہیں ان کا تعلق اس تباہ حال گاڑی سے تو نہیں تھا؟

ایک خیال آیا کہ گن کا بٹ مار کر شیشہ توڑ ڈالوں اور اندر گھس جاؤں، مگر جلد ہی اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا اور یہ ارادہ ترک کر کے پہلے سر پہ آنے والے خطرے سے نمٹنے کا ارادہ کیا۔ دونوں کتے خوفناک انداز میں غراتے ہوئے میرے قریب پہنچ گئے تھے۔ میں ان کی طرف پلٹا۔

اپنی گن کو میں سنگل شاٹ پر ایڈجسٹ کر چکا تھا فوراً ہی سب سے آگے والے ایک کتے پر گولی داغ دی۔ دھماکا ہوا اور کتا اپنے حلق سے عجیب سی آواز نکال کر دھپ سے بھربھری مٹی والی زمین پر گرا اور ختم ہو گیا، اس کے

PkPdf.Blogspot.Com

دوسرے ساتھی نے میدان چھوڑنا بالکل گوارا نہ کیا تو میں نے ایک عدد گولی اسے بھی ٹھونک دی۔ وہ بھی اپنے مردہ ساتھی کے قریب ہی گرا اور ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں نے اب گاڑی کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ لیکن اس سے پہلے میں نے اپنی گن کا میگزین نکال کر چیک کیا تو پسینے سے تر پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ راؤنڈ کم تھے۔ میں نے گاڑی کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس کا اگلا ایک اور پچھلے دونوں دروازے تھوڑا اپچک کر بالکل سیل ہو چکے تھے۔ اگلے دونوں دروازوں کا بھی یہی حال تھا، زور آزمائی کے باوجود وہ نہیں کھلے۔ میں نے پچھلے دروازے کا رخ کیا۔ اس کی حالت مجھے نسبتاً کچھ بہتر محسوس ہوئی تو میں نے اس پر زور آزمائی کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک لاتعداد کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ابھریں..... میں ہولا کر رہ گیا۔ میرے دائیں جانب سے شکاری کتوں کا ایک غول دوڑا چلا آ رہا تھا۔ میرے پاس بچنے کا کوئی اور ٹھکانا تھا نہ ہی راستہ، فقط یہی راہ تھی کہ کسی طرح گاڑی کا یہ دروازہ کھل جاتا اور میں اندر جا بیٹھتا۔ میں نے اپنی کوشش تیز کر دی۔ گن میں اتنی گولیاں نہیں تھیں کہ میں ان خونیں شکاری کتوں کو ختم کر سکتا۔

PakDigestNovels.Blogspot.Com

دروازہ ہلنے لگا۔ میرے دل میں امید پیدا ہوئی۔ میں جنونیوں کے انداز میں دروازہ کھولنے کی تگ و دو میں مصروف ہو گیا، اس کے ساتھ ہی میرے تصور میں عارب خان کا ادھڑا ہوا جسم اور تپتی دھوپ میں گاڑی کے قریب پڑے انسانی پنجرے گردش کرنے لگے اور کیا بعید تھا کہ میرا بھی انہی جیسا حشر ہونے والا تھا؟ ادھر لحہ بہ لحہ کتوں کے بھونکنے اور خونخوار غراہٹوں کی آوازیں مجھے قریب آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ میرے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ کوئی لحہ جاتا تھا کہ میں ان کے نرغے میں تھا اور اسی وقت دروازہ کھل گیا۔ بہت ہی قلیل ترین لمحے میں مجھے ایک بات کا ادراک ضرور ہوا تھا کہ دروازہ محض میری اپنی کوشش سے ہی نہیں کھلا تھا، کسی نے اندر سے بھی کچھ زور آزمائی کی تھی، اس پر زیادہ غور کرنے کا وقت کہاں تھا؟ میں غڑاپ سے عین اس وقت گاڑی کے پچھلے حصے سے اندر کودا تھا جب دو تین کتے خوفناک انداز میں مجھ پر بیک وقت جھپٹے تھے، مگر میں تب تک بجلی کی سی پھرتی سے دروازہ بند کر چکا تھا اور وہ بند دروازے سے ٹکرا کر پلٹ کر گرے تھے، مگر اٹھ کر پھر زور زور سے بھونکنے لگے۔ میں نے گرد سے اٹے پڑے شیشوں سے باہر جھانکنے کی کوشش چاہی تو مجھے گاڑی کے گرد خوں خوار کتوں کا پورا غول چکراتا ہوا دکھائی دیا۔ میں اب بالکل محفوظ تھا۔ لہٰذا ان پر لعنت بھیج کر میں نے گاڑی کے اندر جائزہ لیا تو اچانک مجھے ایک زبردست شاک لگا.....

☆☆☆

شاید اسی نے اپنے ناتواں اور نحیف و نزار وجود کا زور لگا کر اندر سے دروازہ کھولنے میں میری مدد کی تھی۔ اس نے کسی طرح اندر سے دھندلے شیشے کے باوجود مجھے دیکھ لیا تھا۔ گاڑی کے اندر فقط یہی ایک شخص تھا جس کی ہیئت کذائی نہایت خستہ اور ناگفتہ بہ تھی۔ اس کے جسم پر صرف ایک شلوار تھی، وہ بھی جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ اوپری جسم برہنہ تھا اور وہاں خراشیں ابھری ہوئی تھیں، چہرے کا بھی یہی حال تھا۔ وہ ایک جوان اور تگڑا آدمی تھا مگر خستہ حالی اور بھوک پیاس نے اسے جیسے زندہ لاش بنا کر رکھ دیا تھا۔ جب اس کا چہرہ سامنے آیا تو ایک اور شاک میرا منتظر تھا۔ تب میں نے اسے پہچاننے میں مطلق دیر نہیں لگائی تھی، میں حیرت، مسرت کے ملے جلے تاثرات سے اسے تکنے لگا۔

''پپ..... پریل! ای ای..... یہ تم ہو.....؟'' میں بے اختیار چلا اٹھا اور جلدی سے اسے سنبھالا۔ اس کیری کے پچھلے حصے میں کوئی سیٹ نہیں ہوتی، صرف سامان رکھنے کی تھوڑی سی جگہ ہوتی ہے اور وہ ادھر ہی مڑا تڑا لیٹا ہانپ رہا تھا، خود میں بھی مشکلوں سے یہاں جما ہوا تھا باقی سیٹوں کی حالت درست تھی۔ تاہم کیری کے جھکے ہونے کے سبب ہمیں جم کر سیدھے بیٹھنے میں مشکل ہو رہی تھی۔

وہ پریل ہی تھا۔ اس کے ہونٹ پیاس کی شدت سے سوکھ کر چھلکا سا نظر آنے لگے تھے۔ وہاں سپید سپید رنگ کی پپڑیاں جم گئی تھیں۔ نجانے یہ کتنے گھنٹوں سے اسی جگہ محبوس ہو کر بھوکا پیاسا پڑا رہا تھا۔

''تت..... تم.....'' اس نے بھی شاید مجھے اور میری آواز پہچان لی تھی۔ میں نے اسے سہارا دے کر کیری کی باڈی سے ٹکا کر بٹھا دیا تھا۔

''ہاں، پرو! یہ میں ہوں..... تمہارا قیدی دوست شہزی۔'' میں نے کہا۔ اس کے سوکھے ہونٹ میری اس بات پر مسکرانے کی کوشش میں تھوڑا کھنچے تھے۔

''پپ..... پپ..... پانی ہے تمہارے پاس.....؟'' اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

''نہیں دوست! لیکن تم فکر مت کرو..... میں تمہاری تلاش میں ہی نکلا تھا..... ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔'' میں نے اسے تسلی دینی چاہی۔

PkPdf.Blogspot.Com

''تت..... تمہارا شکریہ..... لل..... لیکن یہ مشکل ہے، تم نے کیوں اپنی جان خطرے میں ڈال دی میری خاطر.....؟ اور..... اور..... سس..... سونہڑیں کیسی ہے؟''

میں نے اسے دھیرے دھیرے ساری بات بتادی۔ وہ مجھے خاصا زخمی بھی نظر آرہا تھا۔ اس کا پورا جسم خراش زدہ نظر آرہا تھا، کہیں کہیں سے گوشت نچا ہوا بھی نظر آتا تھا، وہ شاید ان شکاری جنگلی کتوں کے خوفناک نرغے سے بال بال بچ کر یہاں آن چھپا تھا۔

باہر کتے بھونک بھونک کر دھیرے دھیرے واپس پلٹنے لگے تھے۔

میری بات سن کر اس کا خستہ حال چہرہ مزید شکست خوردہ سا نظر آنے لگا مگر اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں شعلوں کی گرمی بھی مجھے محسوس ہوئی تھی۔ اسے لائق ماچھی کی غداری اور دھوکے پر یقیناً غصہ آیا تھا مگر وہ خود کو ازحد بے بس بھی محسوس کررہا تھا تاہم مجھے دیکھنے کے بعد اسے کچھ حوصلہ ہوا تھا، یہی سبب تھا کہ وہ مجھ سے بولا۔

''میں اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ اگر تم نہ آتے تو آج میں نے خود کو ان خونی کتوں کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ یہاں بند قبر میں گھٹ گھٹ کر مرنے سے بہتر یہی تھا کہ ایک بار ہی موت کو گلے سے لگالوں.....''

میں اس کی بات سن کر کانپ گیا اور اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں دوست! ایسا مت کہو..... اللہ مسبب الاسباب ہے..... مایوسی کفر ہے..... دعا کرو اب سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''لل..... لیکن ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے؟ یہ پورا علاقہ ان جنگلی کتوں کا مسکن ہے۔''

''تم مجھے یہ بتاؤ..... کہ جب عارب خان نے دھوکے سے تمہیں یہاں بے ہوش کرکے پھینکا تھا تو..... اللہ ہی نے تمہاری مدد کی تھی نا..... کہ تم اپنی جان، بال بال بچا کر یہاں اس گاڑی کے اندر پناہ لینے میں کامیاب ہوئے اس لیے حوصلہ رکھو..... آگے بھی وہی ہماری مدد کرے گا۔''

''آفرین ہے تم پر دوست! تمہارے ساتھ تو میں نے بس ایک ذرا سی بھلائی کی تھی کہ تمہاری جی داری اچھی لگی تھی مجھے..... اور تم اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر میری تلاش میں یہاں چلے آئے۔ سچ پوچھو دوست! میں تو مایوس ہو چکا تھا اپنی زندگی سے۔ ان خونخوار جنگلی کتوں کے چنگل سے نکلنا میرے بس میں نہیں نظر آرہا تھا۔'' پریل نے ممنون بھرے لہجے میں کہا۔ میں مسکرا کر بولا۔

''بھلائی سے بھلائی ہی جنم لیتی ہے میرے دوست! جس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ مجھے تو اسی رات سے ہی شک ہو چلا تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی زبردست دھوکا ہوا ہے، ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت تمہیں غائب کردیا گیا ہے۔ لیکن سونہڑیں کی طرح میرا دل بھی کہتا تھا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو زندہ ہو..... اسی لیے میں نے تمہیں تلاش کرنے کا اپنے دل میں عہد کر رکھا تھا۔ خیر.....! تمہیں دھوکے سے یہاں لانے والا ایک سازشی تو اپنے عبرتناک انجام کو پہنچ چکا ہے۔ لیکن اس سازش کا اصل ماسٹر مائنڈ یعنی لائق ماچھی زندہ ہے۔ تمہیں میرے ساتھ ابھی واپس جنگل ڈیرے چلنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں دیکھ کر تمہارے ساتھی دوبارہ سے جی اٹھیں گے اور لائق ماچھی جیسے غدار کی تکا بوٹی کرڈالیں گے۔ ان کے حوصلے بلند ہوجائیں گے۔ وہ سب تمہارا ہی ساتھ دیں گے۔''

غدار لائق ماچھی کے ذکر پر پریل چانڈیو کے چہرے پر نفرت وغیظ کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ وہ اسی لہجے میں بولا۔ ''اس ذلیل انسان کو تو میں اپنے ہاتھوں سے عبرتناک انجام تک پہنچاؤں گا لیکن شہزی یار! مجھے اب خود سے زیادہ سونہڑیں کی فکر ہونے لگی ہے۔ تم نے مجھے بتایا کہ وہ بدبخت لائقو..... سونہڑیں کو بھاری تاوان کے عوض واپس اس کے باپ کے حوالے کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اگر ایسا ہوگیا تو بہت ہی برا ہوجائے گا۔'' وہ ایک دم بے چین ہوگیا اور ذرا سانس لینے کو رکا اور پھر تھوڑا سا میری جانب جھکا، میں نے فوراً ایک ہاتھ بڑھا کر اسے سہارا دیا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا۔ کمزوری اور بھوک پیاس کے باعث اس کی سانس بات کرتے ہوئے بار بار پھول رہی تھی۔

PakDigestNovels.Blogspot.Com

''شہزی یار! ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ بالکل بھی نہیں..... کیونکہ..... کیونکہ..... مم..... میں..... اس انا کے مارے ہوئے وحشی انسان شاہنواز خان کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں..... وہ..... وہ..... اُسے مار ڈالے گا..... جان سے مار ڈالے گا وہ ظالم اُسے.....'' یہ کہتے ہی پریل چانڈیو پر ایک عجیب دورہ پڑ گیا۔ وہ ایک دم بہ مشکل تمام اٹھا اور کیری کے عقبی دروازے کی طرف بڑھا۔ میں اس کی حرکت پر حیران ہوکے اچھل پڑا اور اسے پشت سے پکڑ کر تھام لیا۔

''یہ کیا کررہے ہو..... تم؟ کہاں جارہے ہو؟ باہر موت بکھری ہوئی ہے۔''

PkPdf.Blogspot.Com

''نہیں، شہزی یارا.....! چھوڑ دو مجھے..... میں..... میں سونہڑیں کو اس کے باپ کے حوالے نہیں ہونے دوں گا.....'' یہ کہتے ہوئے اس نے مقدور بھر زور آزمائی کرنی چاہی مگر میں نے اسے آرام سے تھام کر دوبارہ سیٹ پر بٹھا دیا۔ کیری کے سائڈ سے ٹائرز برسٹ ہونے کے باعث چونکہ وہ ایک طرف کو جھک گئی تھی اسی لیے سیٹ پر سیدھے بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔

''حوصلہ کرو دوست! ہم یہاں سے جلد ہی نکل جائیں گے۔ کیوں فکر کرتے ہو.....؟ مجھے کچھ سوچنے دو ذرا.....''

میری بات پر ذرا تھم تو گیا مگر اس کے چہرے پر بے چینی و تشویش کے سائے، لحہ بہ لحہ گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ اسے کسی طور قرار نہیں آ رہا تھا لیکن ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ خود مجھے بھی اس کی بے قراری اور بے چینی دیکھ کر اس بات پر تشویش ہونے لگی تھی کہ کہیں واقعی اس کا خدشہ درست تو نہیں تھا؟ یہ شاید ایکشن کاری ایکشن تھا۔ لیکن ساتھ ہی میں اپنے اس خیال نما خدشے کو رد بھی کرتا کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ کوئی باپ اپنی اولاد اور وہ بھی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر سکتا ہے.....؟

پریل ہانپنے لگا۔ میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ کیری کا اندر سے تفصیلی جائزہ لینے لگا۔ باہر سے اس کی حالت جتنی خستہ تھی اتنی اندر سے محسوس نہیں ہوئی۔ ماسوائے کھڑکیوں کے شیشوں کے..... اندر سے تو میں نے ایک... ڈسٹر نما کپڑا ڈھونڈ کر اس کے شیشے صاف کر لیے تھے مگر باہر سے ان پر گرد و غبار چپکا ہوا تھا۔ اسے صاف کرنے کے لیے مجھے کیری سے باہر اترنے کا رسک لینا پڑتا۔ جس کا... فی الوقت میں نے ارادہ ملتوی کر رکھا تھا۔ لیکن یہ کرنا ضروری بھی تھا۔ تاہم میں اس کا انجن چیک کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا میں اٹھ کر اگلی سیٹ پر آیا۔ اگنیشن میں چابی لگی ہوئی تھی۔ میں نے گیئر چیک کیا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بہ مشکل ٹک کر بیٹھ گیا۔ ''بہ مشکل'' اس لیے کہ کیری ایک طرف سے جھکی ہوئی تھی۔ اگر کیری اسٹارٹ ہو جاتی تو میں اسے برسٹ زدہ ٹائروں سے ہی کھینچتا ہوا اس علاقے سے دور لے جاتا یا کوئی اور نسبتاً بہتر صورت اپناتا۔

''میں یہ کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں.....'' عقب سے اچانک پریل کی آواز ابھری۔

میں نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے اللہ کا نام لے کر اگنیشن سوئچ میں چابی گھمائی..... ''چززز..... زززز.....'' کی آواز ابھرتی رہی مگر انجن بیدار نہ ہوا..... میں دوبارہ کوشش کرنے لگا۔

''اس کی بیٹری بھی ڈاؤن ہے اور انجن میں بھی گڑبڑ ہے۔'' اس نے دوبارہ پیچھے سے ہانک لگائی۔

''یار! مجھے دیکھ تو لینے دو.....'' اس کے مسلسل اس طرح بولنے پر میں نے چڑ کر کہا۔ موجودہ صورت حال نے مجھے بھی چڑچڑا سا کر ڈالا تھا۔ پریل چانڈیو محسوس کر گیا اور ہولے سے بولا۔

''معاف کرنا یار!''

مجھے اس پر ترس سا آ گیا۔ میں نے اگلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اپنی گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ وہ بھی ہنس دیا اور اپنا ایک ہاتھ دوستانہ انداز میں میری طرف بڑھایا تو میں نے بھی اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھا کر تالی بجا دی۔

''میں کسی بھی حال میں ناامید نہیں ہوتا..... اللہ پر بھروسا کر کے کوئی نہ کوئی صورت نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے مسکراتے لہجے میں کہا۔

''اچھی عادت ہے..... پسند آئی مجھے.....'' وہ بھی اسی انداز میں بولا۔

کیری اسٹارٹ نہ ہو سکی۔ میں نے پہلے اس کے اگنیشن سوئچ کے تاروں کا گچھا باہر نکال لیا۔ جو اسٹیئرنگ کے نیچے ہی کہیں جڑا ہوا تھا۔ وہ سب ٹھیک تھا۔ اس کے بعد میں اٹھ کر پچھلی سیٹ پر آیا اور انجن چیک کرنے لگا۔ اس میں واقعی خرابی تھی۔ میں وہیں بیٹھ گیا اور گرد آلود شیشے سے باہر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ اندر گھٹن اور حبس بڑھنے لگا تھا۔ گرمی کا بھی یہی حال تھا۔

میں نے تھوڑے تھوڑے شیشے کھول لیے تھے تاکہ کم از کم آکسیجن ملتی رہے۔ ورنہ تو باہر بھی بادِ سموم ہی چل رہی تھی..... میں ایک ہاتھ باہر نکال کر کسی میلے کپڑے سے شیشے صاف کرنے لگا۔ جنگلی کتے اِدھر اُدھر زمین اور ٹیلوں کی ڈھلوانوں پر بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ یہ سب ہماری کیری سے زیادہ دور نہیں تھے اور اطراف میں ایک گھیرا سا ڈالے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ میں ان کی مکاری دیکھ کر اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ مجھے عارب خان کی بات یاد آ گئی۔ اسی نے ہی کہا تھا کہ جنگلی کتوں کا یہ غول بڑا مکار اور بے رحم ہوتا ہے۔ شکار کو پا کر یہ اسے ہرگز نہیں چھوڑتے۔ میں نے دیکھا تھا کہ کتے تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس طرف اپنی تھوتھنی اٹھا کر دیکھ لیتے تھے، جدھر ہماری کیری موجود تھی۔

PkPdf.Blogspot.Com

دھوپ خاصی تیز نکلی ہوئی تھی مگر انہیں اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وقت گزر رہا تھا، لگتا تھا کہ دن اب دھیرے دھیرے ڈھل رہا ہے۔

معاً ایک کتے کو میں نے بدستور اپنی منحوس تھوتھنی اٹھائے اسی طرف تکتے پایا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کیری کی طرف بھاگتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ ان بدبختوں کا ایک عجیب سا خوف مجھ پر طاری تھا۔ کتے کو اپنی طرف آتا دیکھ کر میں نے لپک کر شیشے بند کر دیے۔ حالانکہ وہ پہلے ہی محض جھری بنانے کی حد تک ہی کھلے ہوئے تھے۔ شیشے صاف ہونے کے بعد اب میں باہر دیکھ سکتا تھا۔ اس ایک کتے کے لپکنے سے باقی خبیث کتے بھی بھونکتے غراتے ہوئے کیری کی طرف لپکے اور پھر وہی منحوس کھیل شروع ہو گیا۔ یعنی وہ کیری کے گرد چکر کاٹنے لگے۔ کئی ایک تو اپنی پچھلی دونوں ٹانگوں پہ کھڑے ہو کے اگلی دونوں ٹانگیں کیری کی باڈی سے ٹکا کر اپنے خوفناک تھوتھنے شیشے کے ساتھ رگڑنے لگے اور خونخوار انداز میں غراتے بھی جاتے۔

میں غصیلے انداز میں انہیں شیشے کے پار سے گھور کے پریل کے سامنے والی سیٹ پر ٹک کر بیٹھ گیا۔ مردود کتوں کے دھکوں سے کیری بھی ہل رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک بھونکتے اور غراتے رہنے کے بعد یہ غول ''پخ..... پخ'' کرتا ہوا پلٹ گیا۔

میں نے سامنے سیٹ پر بیٹھے پریل کی طرف دیکھا، وہ نڈھال سا ہو رہا تھا۔ بڑی اکتا دینے والی اور اس سے زیادہ مشکل صورتِ حال تھی۔ رفتہ رفتہ دن ڈھلنے لگا۔ پریل پر نیم بے ہوشی سی طاری تھی۔ میں نے اسے اسی طرح ہی رہنے دیا۔ جاگتا تو پھر سونہڑیں کی طرف سے اسے بے چینی ستانے لگتی۔

میں نے شیشے کے پار سے اطراف میں نظریں دوڑائیں..... بنجر ویرانی اور سناٹے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کتے اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔ میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ شاید کوئی مدد آ جائے۔ شاید کوئی گاڑی یہاں سے گزرے اور ہم پر اُن کی نگاہ پڑ جائے۔ پتا نہیں یہ قبولیت کی کون سی گھڑی تھی کہ تھوڑی دیر بعد جب شام کا دھندلکا چہار اطراف میں پھیلنے لگا تو اچانک میں ٹھٹکا۔ ایک جانب مجھے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس متحرک نظر آئی۔ میرا دل خوش امیدی کے باعث تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے آہستگی سے اس طرف کا شیشہ ہٹایا اور ایک ہاتھ باہر نکال کر لہرانے لگا۔ اسی وقت کتے بھونکتے ہوئے اس گاڑی کی طرف لپکے۔

گاڑی کا رخ دوسری طرف تھا۔ کتوں کے غول کو دیکھ کر ڈرائیور نے اس کی رفتار بڑھا دی تھی۔ کتوں کا پورا غول اس کے تعاقب میں دوڑا گیا حتیٰ کہ مجھے گاڑی کی ٹیل لائٹ نظر آنے لگیں۔ بے بسی اور مایوسی کے عالم میں، میں نے کیری کی باڈی پر مُکا جڑ دیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ایک خیال بجلی کی سی سرعت کے ساتھ میرے ذہن میں ابھرا اور پھر میں نے پریل کو جھنجوڑ ڈالا.....

''پپ..... پریل! اٹھو..... جلدی کرو..... یہاں سے بھاگ نکلنے کا موقع ہاتھ لگا ہے۔'' وہ پہلے تو اپنے حلق سے نحیف و نزار سی آوازیں خارج کرتا رہا، اس کے بعد..... اس نے نیم وا کر کے آنکھیں کھولیں اور میں نے دوبارہ اسے جھنجوڑا۔ وہ بیدار ہوا اور میں نے دروازہ کھول دیا۔

''کتے کسی گاڑی کے تعاقب میں بھاگے ہیں..... موقع اچھا ہے..... نکل چلو.....'' کوئی اور موقع ہوتا تو شاید وہ یہ رسک لینے کی ہمت نہ کرتا مگر وہ سونہڑیں کے تازہ ترین اور سنگین معاملے کی وجہ سے میرا ساتھ دینے پر فوراً ہی راضی ہو گیا۔

میں نے کیری کا پچھلا دروازہ کھولا اور باہر جھانکا۔ کوئی کتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کھائی کی طرف بھی سناٹا طاری تھا۔ میں پریل کو سہارا دیتے ہوئے دھڑکتے دل کے ساتھ کیری سے نیچے اترا۔ ان وحشی اور خوں خوار جنگلی کتوں کا خوف مجھے بھی تھا لیکن جستجوئے بقا کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے گن اپنے کاندھے پر اٹکا دی تھی اور اپنے جیسے گرانڈیل پریل کو سہارا دیتا ہوا ایک طرف کو بڑھنے لگا۔ میرا دل بھی اسی تیزی سے دھڑکے جا رہا تھا۔ ہم اپنی ''پناہ گاہ'' سے دور ہو چکے تھے۔ اگر کتے واپس لوٹ آتے تو ہمارے پاس اتنا وقت بھی نہیں بچتا کہ ہم واپس کیری میں داخل ہوتے۔ اب تخت تھا یا تختہ..... والی بات تھی۔

میرے دل سے اس بات کا خدشہ ایک لمحے کے لیے بھی محو نہیں ہوا تھا کہ اگر کتے لوٹ آتے تو ہم دونوں کا کیا حشر ہوتا..... اطراف کا منظر بڑا خشک، بے رحم اور گرم ہو رہا تھا۔ آسمان پر گرم سی شام کی سرخی پھیل رہی تھی۔

ایک جنون سا تھا کہ میرے رگ و پے میں پارے کی مثل دوڑنے لگا تھا اور میں رکے بغیر پریل کو کھینچے ایک طرف لیے جا رہا تھا کہ اچانک میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں سے ایک آواز ٹکرائی۔ وہ ایک خوفناک سی غراہٹ تھی۔ میں نے شام کی ملگجی سی تاریکی میں اس منحوس آواز کی طرف دیکھا اور اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ دو کتے خوفناک جبڑے پھاڑے

PkPdf.Blogspot.Com

عجیب مکارانہ سے انداز میں میرے عقب میں پہلے تیز تیز اور پھر جب مجھے اپنی جانب دیکھتے پایا تو یک دم دوڑ پڑے۔ نجانے یہ اس غول میں شامل ہونے سے کیسے بچ گئے تھے۔ یا پھر ادھر اندھے گڑھے میں پڑے سو رہے تھے کہ ہماری بُو پا کر اس طرف نکل آئے۔

میں نے پریل کو چھوڑا۔ وہ چکرانے کے سے انداز میں خشک بنجر زمین پر ڈھے گیا۔ دونوں کتے خوفناک جبڑے پھاڑے گولی کی رفتار سے میری طرف دوڑے چلے آرہے تھے۔ میں نے گن پشت سے لے کر دونوں ہاتھوں میں پکڑلی اور نال کا رخ ان کی طرف کر کے تلے اوپر دو تین فائر جھونک دیے۔ دھماکے ہوئے اور دونوں کتے خاک چاٹنے لگے۔ میں نے گن پھر پشت پر ٹکائی اور جھک کر پریل کو سنبھالا۔ اس کے بعد اسے لیے آگے بڑھنے لگا۔ خدشہ اس بات کا قوی ہو چکا تھا کہ گولیوں کی آواز سن کر خوں خوار کتوں کا غول اس طرف کا رخ کر سکتا ہے جبکہ مجھے ابھی تک کوئی ایسی جگہ یا پناہ گاہ دکھائی نہیں دی تھی جسے میں محفوظ خیال کرتا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ مجھے سامنے ایک بڑا سا ٹیلا نظر آیا تھا۔ مجھے امید سی تھی کہ اس کے پار ہمارے لیے کچھ بہتری کا سامان ہو سکتا ہے۔ یہ سوچ کر میرے تھکے ہارے وجود میں جیسے ایک نئی طاقت سی دوڑ گئی۔ پریل کچھ خوف زدہ سا نظر آنے لگا تھا۔ حالانکہ اس کی زندگی ایسے دل اندوز واقعات سے بھری پڑی تھی لیکن اس طرح کی بے بسی کی موت کا تصور اچھے اچھوں کا پتا آب کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے جبکہ خود میرا اپنا بھی یہی حال تھا۔

ایک مقام پر ٹیلے کی ڈھلان چڑھتے ہوئے..... پریل کو سنبھالے سنبھالے میرا ایک پاؤں رپٹ گیا اور میں گر پڑا۔ پریل بھی میرے ہی سہارے تھا، وہ بھی گرا۔ ٹیلا خاصا بلند تھا اور ہم دونوں ہی لڑھکتے ہوئے نشیب میں جانے لگے۔

ٹیلے کی ڈھلان پر جا بجا جھدری جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں..... میں نے ایک کو تھام لیا، وہ پُرخار تھی، تکلیف سے میری کراہ آمیز چیخ نکل گئی۔ ہتھیلی پہ چبھنے والے کانٹوں سے خون رسنے لگا۔ میں نے وہ خارزدہ جھاڑی چھوڑ دی۔ پریل بھی ایک طرف کی جھاڑیوں کے جھنڈ میں اٹک کر رک گیا تھا۔

میں لیٹے لیٹے اس کی جانب کھسکا اور یہی وہ وقت تھا جب ایک آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی اور میرے رگ و پے میں خوف کی پھریری سی دوڑ گئی۔ یہ اَن گنت بھاگتے ہوئے جنگلی کتوں کی آوازیں تھیں۔ وہ شاید مذکورہ گاڑی کا ناکام تعاقب کرنے کے بعد نجانے اب کدھر سے واپس لوٹ رہے تھے۔ تاہم ان کے بھونکنے کی آواز مدھم سی تھی اور اس سے زیادہ خوف طاری کیے دے رہی تھی۔ کتوں کے نرغے میں پھنس کر موت کے منہ میں جانے کا تصور ہی روح فرسا ہوتا ہے۔ میں نے اپنے وجود کی ساری طاقت مجتمع کرتے ہوئے ایک بار پھر پریل کو سنبھالا اور اس سے ہانپتی ہوئی آواز بولا۔

''پریل.....! اٹھ، وقت بالکل نہیں ہے ہمارے پاس..... کتے واپس لوٹ رہے ہیں، انہوں نے شاید ہماری بُو سونگھ لی ہے۔''

''تت..... تم بھاگ جاؤ دوست! مجھے چھوڑ دو..... اِدھر ہی..... میں اب نہیں چل سکتا۔ سس..... لل..... لیکن سونہڑیں کو کبھی اس کے باپ کے حوالے نہ.....''

''کیا بکواس کر رہے ہو تم پریل! تمہاری خاطر میں نے اپنی جان خطرے میں ڈال دی ہے اور تم کہتے ہو میں تمہیں یہاں ان جنگلی شکاری کتوں کا نوالہ بننے کے لیے چھوڑ دوں..... ہرگز نہیں، اٹھو.....'' میں نے یہ کہتے ہوئے اسے سہارا دیا۔ اس نے بھی کچھ ہمت سے کام لیا اور اپنے ڈھتے ہوئے وجود کی طاقت کو مجتمع کرتے ہوئے میرے ساتھ ڈھلان پہ چڑھنے لگا۔

''مجھے..... پورا یقین ہے.....'' میں نے ہانپتے ہوئے کہا اور ایک نظر عقب میں ڈالی جہاں سے میرا خیال تھا کہ کتوں کا غول ہمارے تعاقب میں دوڑا چلا آرہا تھا۔

''اس ڈھلان کی دوسری طرف..... کوئی نہ کوئی محفوظ پناہ گاہ ہمیں مل جائے گی۔''

پریل بھی اپنی سی کوشش کر رہا تھا میرا ساتھ دینے کی اور میں نے تو اپنا تن من دھن لگا رکھا تھا۔ جیسے ہی ہم ٹیلے کی چوٹی پر پہنچے..... اور میں نے عقب میں دیکھا تو دھک سے رہ گیا۔ ٹیلے سے نیچے تھوڑی دور پھیلے بھربھری مٹی والے میدان میں خونی کتوں کا غول گولی کی رفتار سے ہماری طرف دوڑا چلا آرہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی عبرت ناک موت کے جاں گسل تصور سے میرا رُواں رُواں کانپنے لگا۔ موت کو سامنے دیکھ کر میرے اعصاب شل سے ہونے لگے اور ہمت جواب دینے لگی۔ جانے یہ ان منحوس کتوں کا کیسا خوف تھا جو بری طرح میرے اعصاب پر سوار ہو چکا تھا۔

''مم..... مجھے ان کے سامنے پھینک کر بھاگ جاؤ..... یہ میرے ساتھ مصروف ہو جائیں گے اور تمہیں

PkPdf.Blogspot.Com

Best Novels And Books

PkPdf.Blogspot.Com

PkPdf.Blogspot.Com

PkPdf.Blogspot.Com

PkPdf.Blogspot.Com

PkPdf.Blogspot.Com

بھاگنے کا موقع.....'' پریل کی آواز حلق میں دب گئی۔ میں اس کی بات کاٹ کر چیخا۔

''پریل! ہمت کرو..... مجھے ایک محفوظ پناہ گاہ نظر آگئی ہے۔'' یہ کہتے ہی میں اسے اپنے ساتھ کھینچنے لگا۔ کتوں کا غول بدستور دوڑتا ہوا ہماری طرف آرہا تھا۔ وہ ایک ہیبت ناک اور کریہہ انگیز موت کی صورت میں ٹیلے کی ڈھلان پر چڑھتے ہوئے دوڑتے نظر آرہے تھے۔ چوٹی پر پہنچتے ہی میں نے پریل کو زور سے دوسری طرف نیچے نشیب میں دھکا دیا اور خود بھی اس کے ساتھ ہی رگیدتا ہوا نیچے لڑھکتا چلا گیا اور پھر جیسے ہی کتوں کی خونخوار تھوتھنیاں ٹیلے کی چوٹی سے نمودار ہوئیں..... میں اور پریل..... قریب بہتی ایک قدرے چوڑے پاٹ والی نہر کے ریتیلے کراڑے پر آن گرے تھے۔ وہاں سے لڑھکتے ہوئے ہم سیدھے بہتی نہر میں جا گرے۔

گرمی اور تپش کے مارے ہوئے وجود، نہر کے ٹھنڈے پانی کی برودت میں جیسے اچانک ہی جی اٹھے تھے۔

میں نے پریل کو سنبھال لیا تھا اور ہم اب دونوں گویا ایک دوسرے کو تھامے ہوئے نہر کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہے چلے جارہے تھے۔ ادھر جنگلی کتے..... نہر کے کنارے کنارے ریتیلے کراڑے پر، ہمارے ساتھ ساتھ ہی دوڑ رہے تھے۔ میری کوشش یہی تھی کہ ہم کنارے سے دور ہی رہیں۔ کیا خبر کوئی بھوکا کتا جوشِ شکم سیری میں ہم پر وہیں سے ہی چھلانگ لگا لیتا۔ میں نے اپنا ہی نہیں بلکہ پریل کا منہ بھی پانی کی سطح سے اوپر کر رکھا تھا، تاکہ غوطہ نہ لگ سکے۔ ورنہ بہتی نہر میں ایک بار غوطہ کھانے کے بعد برا حال ہو جاتا ہے۔ ہم اس کے ساتھ ہی بوقتِ ضرورت اپنے ہاتھوں پیروں کو بھی متحرک کیے ہوئے تھے۔ تاکہ ڈوبنے سے بھی بچے رہیں۔

''شش..... شہزی!''

اسی وقت مجھے کانوں میں پانی کے شور میں پریل کی ڈوبی ڈوبی سی آواز سنائی دی۔

''ہم بچ گئے شہزی.....! ہم بچ گئے.....'' وہ کہہ رہا تھا۔ میری طرح اسے بھی خوشی تھی تاہم میں ابھی پورے یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم خطرے سے بالکل باہر نکل آئے ہیں کیونکہ ایک تو ہم نہر میں تھے اور دوسرے یہ کہ کتے ابھی تک ہمارے تعاقب میں تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ یہ نہر میں ہی کود پڑتے۔

''ہاں پریل! شاید تم ٹھیک کہتے ہو مگر ہمیں اب بھی ہمت اور حوصلے کا دامن نہیں چھوڑنا ہے.....'' میں نے کہا۔

''تم سمجھے نہیں میری بات.....'' وہ بولا اور میں حیران سا ہوا۔

''یہ نہر..... جنگل ڈیرے کے قریب سے گزرتی ہے۔'' اس نے اپنی خوشی کی اصل وجہ بتا کر مجھے بھی ایک خوشگوار سی حیرت سے دوچار کر ڈالا۔

''اچھا.....! یہ تو اور بھی اچھی بات ہوگئی.....'' میں نے بھی خوش ہو کے جواب میں کہا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اب پریل کے وجود میں بھی کوئی انجانی سی طاقت دوڑ گئی تھی۔ اسی سبب ہم نے دوسرے کنارے پر اترنے کے بجائے اسی طرح تیرتے رہنے پر ترجیح دی تھی۔

نہر آگے جا کر قوس کی صورت میں گھنی جھاڑیوں اور آک ... کے موٹے کڑوے پتوں والے گھنے پودوں میں گم ہو رہی تھی۔ جو کنارے پر بہت آگے تک نہر پر جھکے ہوئے تھے۔ تب ہی میں نے محسوس کیا کہ کتوں کے دوڑنے کی رفتار بتدریج آہستہ ہوتی جارہی تھی..... یہاں تک کہ ان کی تعداد میں بھی کمی آنے لگی۔ بیشتر کتے زبان باہر نکالے ہانپ رہے تھے اور رکتے جارہے تھے۔ قوس کی شکل میں خطرہ تھا کہ ہم دونوں کنارے سے جا لگتے اور یہی ہوا..... جیسے ہی ہم نہر کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ موڑ کاٹنے لگے..... ہمارا رخ کنارے کی طرف ہونے لگا۔ گن ہنوز میرے کاندھے سے لگی ہوئی تھی۔ میں نے پریل کو خبردار کر کے اسے چھوڑ دیا اور کنارے کے قریب آتے ہی میری گن میں جتنی بھی گولیاں تھیں وہ میں نے کنارے پر دوڑتے ہوئے باقی ماندہ کتوں پر برسا دیں، وہ سب ڈھیر ہو کر گرنے لگے اور شاید تعداد کی کمی کے باعث وہ بھی پیچھے ہٹنے لگے۔ موڑ کاٹتے ہی میں اور پریل دوبارہ ایک دوسرے کے ساتھ آن ملے۔ خالی گن میں نے پھینک دی اور خود کو پانی کے بہاؤ کے سپرد کر دیا۔

بہاؤ زیادہ تیز نہ تھا مگر اتنا کم بھی نہ تھا..... موڑ کاٹتے ہی نہر کے دونوں کناروں پر لانبے گھنے پیڑوں کے جھنڈ نمودار ہونے لگے۔ جن کی شاخیں سطحِ آب پر جھکی ہوئی عجیب منظر پیش کر رہی تھیں۔ میں نے کنارے کی طرف دیکھا، کتے غائب ہو چکے تھے۔

''کیا خیال ہے دوست! اب کنارے کا رخ کیا جائے؟'' میں نے پریل سے پوچھا۔

''ابھی نہیں، میں بتاؤں گا۔'' اس نے جواب دیا۔

ہم اسی طرح خود کو بہاؤ کے سپرد کیے تیرتے رہے۔ پریل غور سے گردوپیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب ایک پُلیا کے نیچے سے ہم گزرے تو پریل نے مجھے دوسرے کنارے پر نکل جانے کا کہہ دیا۔ ہم ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے دوسرے کنارے کے قریب ہونے لگے اور پھر کنارے پر پھیلی ہوئی آبی جھاڑیوں اور پودوں کو دبوچ کے ہم نے اپنی رفتار جام کی اور کنارے پر نکل آئے۔

خشکی پر آتے ہی ہمارے وجود کی تھکن جیسے ایک دم بیدار ہوگئی اور ہم خاصی دیر تک اسی طرح کنارے پر پڑے ہانپتے رہے..... گھنا جنگل دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ دور تک چلا گیا تھا۔ ستانے کے بعد ہم ذرا باتیں کرنے کے قابل ہوئے تو پریل نے مجھے بتایا کہ یہ نہر ''گاج ندی'' کہلاتی ہے، جسے مقامی زبان میں ''گاج نین'' کہا جاتا ہے اور یہ آگے کئی میل جا کر دریائے سندھ میں جا گرتی ہے۔ یہاں سے جنگل ڈیرا زیادہ دور نہیں تھا۔

''اس صورت میں جبکہ.....'' میں نے کسی محتاط خیال کے پیشِ نظر اس سے کہا۔ ''تمہارا غدار نائب لائق ماچھی گروہ کا سرغنہ بن چکا ہے، میرا نہیں خیال کہ وہ ہمارا خوشی سے استقبال کریں گے؟''

پریل چانڈیو میرا اشارہ سمجھ کر تلخ مسکراہٹ سے بولا۔ ''مجھے اس کا اندازہ ہے..... چلو آگے بڑھو۔''

ایک مصیبت سے نجات ملتے ہی اس کے درماندہ وجود میں بھی نئی طاقت دوڑ گئی تھی۔ ہم دونوں اٹھے اور آگے بڑھ گئے۔ اب راستوں کی راہنمائی پریل کر رہا تھا۔ وہ یہاں کے چپے چپے سے واقف تھا۔ ہم دونوں چھپتے چھپاتے جنگل میں راستہ بناتے آگے بڑھ رہے تھے۔ پریل کے مطابق اس کے ساتھی اسے دیکھ کر خوش تو ضرور ہوں گے لیکن جو کسی وجہ سے لائق ماچھی کے ساتھ مل چکے تھے، وہ بھی اپنے پرانے سرغنہ کو دیکھ کر اس سے آن ملیں گے..... ایک بڑی جنگ کا خطرہ پھر بھی موجود تھا مگر پریل کو یقین تھا کہ عبرتناک شکست پھر بھی غدار لائق ماچھی کے حصے میں آئے گی۔ کیونکہ پریل کے وفاداروں کو ابھی تک یہ کھٹک ہوگی کہ آخر ان کا سردار سائیں (پریل) اچانک کہاں غائب ہوگیا لیکن وہ شاید اب اپنی جان کے خوف سے مصلحتاً خاموش تھے۔

تھوڑی دیر بعد پریل کے مطابق جنگل ڈیرے کی حدود شروع ہوچکی تھی۔ اب ہم دونوں محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ شام کے ملگجے سائے رات کی گہری تاریکی میں مدغم ہو چکے تھے۔ ہم اسی کا حصہ بنے آگے بڑھتے رہے۔ ایک خطرے سے بچ کر تو نکل آئے تھے مگر اب دوسرا خطرہ ننگی تلوار بن چکا تھا لیکن میں دیکھ رہا تھا، پریل مطمئن تھا یا پھر شاید اسے اپنے گروہ کی تازہ صورتِ حالات کا اندازہ نہ تھا جتنا کہ مجھے تھا۔ ہم خالی ہاتھ تھے جبکہ پریل اپنے وفادار ساتھیوں پہ تکیہ کیے ہوئے تھا۔

بہرحال ہم محتاط روی کے ساتھ بدستور آگے بڑھتے رہے۔ فضا میں حبس کی کیفیت تھی۔ آسمان صاف تھا اور دور کہیں اماوس کا چاند ہونے کے باعث جنگل میں کچھ زیادہ ہی تاریکی تھی۔ میں تو بہت پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا اور سانپوں کا بھی ڈر تھا مجھے..... لیکن پریل یوں بڑھا چلا جا رہا تھا جیسے اسے سب نظر آ رہا ہو..... اب میرے بجائے وہ راہنمائی کر رہا تھا۔ اچانک ایک مقام پر وہ قدرے ٹھٹک کر رکا۔ میں بھی رک گیا۔ وہ جیسے کوئی سن گن لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بعد مجھ سے سرگوشی میں بولا۔

''ہم منزل کے بہت قریب ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پہرے پر صرف دو افراد تعینات کیے جاتے ہیں، کیونکہ اس طرف کسی خطرے کا عمل دخل کم ہی ہوتا ہے۔''

''کیا تم ان دونوں پہرے داروں سے بھڑ جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور آگے قدم بڑھا دیے۔ میں اس کے پیچھے چلا۔ ابھی ہمیں تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اچانک ایک قہقہے کی آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔ میں چونک کر رکا مگر پریل مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید پریل کے کانوں نے قہقہے کی آواز نہیں سنی ہوگی، میں ابھی اسے یہ بتانے ہی والا تھا کہ دفعتاً پریل کو میں نے دبک کر رکتے پایا۔ میں بھی رک گیا۔ تب ہی مجھے گہری خاموشی کے دامن میں باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے اسی طرف دیکھا، پریل کی نظریں بھی وہیں جمی ہوئی تھیں۔

''ان دونوں میں سے ایک میرا ساتھی ہے۔'' معاً پریل نے سرسراتی سرگوشی میں مجھ سے کہا۔

''کیا تم ان پر جھپٹنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''نہیں..... آؤ میرے ساتھ..... لیکن میرے پیچھے ہی رہنا۔'' کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے عقب میں قدم بڑھاتا رہا۔

''دل مراد..... ہوشیار.....'' اچانک پریل نے ٹھہر کر قدرے بلند آواز میں کہا۔ اس طرف مجھے روشنی سی نظر آئی تھی۔ کمزوری کے باعث اس کی آواز میں ویسا رعب

اور دبدبہ نہ تھا..... لیکن میں نے دیکھا اس کی آواز پر یکلخت دو مسلح آدمی اسی روشنی والی جگہ سے نمودار ہو کر سامنے آ گئے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ جس کا چکارا خاصے پھیلاؤ والا تھا۔

''سس..... سردار سائیں.....! تت..... تم۔'' ٹارچ والے کے منہ سے مسرت بھرے الفاظ ابھرے۔ شاید یہی دل مراد تھا جبکہ اس کا دوسرا ساتھی خاموش تھا، حیرت اس کے چہرے پر بھی طلوع ہوئی تھی مگر اس نے کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہ کیا تھا۔ میں اس کی طرف سے ہوشیار تھا۔

''کیسے ہو تم دل مراد؟ پہچان لیا مجھے.....؟'' پریل اس سے بولا۔ ''لیکن لگتا ہے، شنواری نے مجھے نہیں پہچانا ابھی تک.....'' اس نے آخر میں اس کے برابر میں کھڑے دوسرے مسلح آدمی پر نظر ڈال کر کہا تو وہ اچانک جیسے گڑبڑا کر بولا۔

''نن..... نہیں سردار سائیں! بھلا آپ کو میں کیسے نہیں پہچانوں گا.....'' تب ہی اچانک دل مراد نے ایک عجیب حرکت کر ڈالی۔ اس نے پلک جھپکتے ہی اپنی گن کی نال شنواری نامی اس آدمی کی کنپٹی سے لگا دی۔

''اپنی گن پھینک دو شنواری! اگر ذرا بھی کوئی غلط حرکت کی تو گولی مار دوں گا۔''

شنواری گم صم ہو گیا۔ چونکا میں بھی تھا مگر پریل نے دل مراد سے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''دل مراد! یہ کیا حرکت ہے؟''

''سردار سائیں! یہ اسی غدار لائق ماچھی کا آدمی ہے۔'' دل مراد نے جواب دیا۔

''نہیں دل مراد۔'' پریل بولا۔ ''غدار صرف لائقو ہے، یہ لوگ نہیں..... انہیں ورغلایا گیا ہے اور میں ایسے لوگوں کی غلط فہمی دور کر دوں گا۔ گن نیچے کر لو۔''

دل مراد چند ثانئے مخمصے کا شکار رہا اس کے بعد اس نے حکم کی تعمیل کر ڈالی۔ میری نظریں شنواری کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ پریل نے شنواری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم اب بھی لائق ماچھی کو اپنا سردار سائیں تسلیم کرتے ہو؟'' اس کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ شنواری اچانک پریل کے قدموں میں گر پڑا۔

''سائیں! مجھے معاف کر دو..... ہم لالچ میں آ کر اس بدبخت لائقو کے کہنے میں آ گئے تھے۔ آپ ہی ہمارے سردار سائیں ہو اور کوئی نہیں۔''

پریل نے شنواری کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام کر کھڑا کر دیا اور بولا۔

''شنواری! میں کسی قسم کا خون خرابا کرنے نہیں آیا ہوں..... ورنہ جانتا ہوں میں کہ اگر اس وقت میں خود کو ظاہر کر دوں تو گروہ میں زبردست جنگ پڑنے اور کشت و خون پھیلنے کا خطرہ ہے۔ اگر لوگ لائق ماچھی کو اپنا سردار سمجھتے ہیں تو بے شک وہ اس کے ساتھ اپنا الگ گروہ بنا لیں، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میں اس کا قصور بھی معاف کرنے کو تیار ہوں لیکن اس نے میرے دوست شہزی اور سونہڑیں کے ساتھ جو کمینہ پن کیا ہے، اس کا اس مردود کو حساب دینا ہو گا۔''

''بالکل سائیں! آپ برابر بولتے ہو۔'' شنواری بولا۔ ''آپ ابھی ہمارے ساتھ چلیں..... آپ کو دیکھ کر وفاداروں کے حوصلے بلند ہو جائیں گے۔ وہ سخت مایوسی کا شکار ہیں۔ ہمیں خوشی ہوئی ہے کہ آپ زندہ ہیں لیکن سائیں! کیا تم جانتے ہو کہ سونہڑیں بھاجائی کے ساتھ اس مردود نے کیا حرکت کی ہے؟''

سونہڑیں کے متعلق اس کے کہنے کا انداز اس طرح کا تھا کہ پریل کا چہرہ یک دم فق ہو گیا۔

''اس نے سونہڑیں کے ساتھ کیا کیا ہے؟ جلدی بتاؤ مجھے.....؟'' پریل بپھر کر بولا۔

''سس..... سائیں! اس خبیث نے بھاجائی سونہڑیں کو بھاری تاوان کے عوض دوبارہ اس کے باپ زمیندار شاہنواز خان کے حوالے کر دیا ہے.....'' اس بار دل مراد نے بتایا اور میں نے دیکھا اس انکشاف پر پریل کا چہرہ ایک دم دھواں دھواں ہو گیا۔ اگرچہ خود میرے لیے یہ خبر غیر متوقع نہ تھی، کیونکہ مجھے پیشگی ہی اس بات کا علم تھا کہ لالچی لائقو..... معصوم سونہڑیں کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا اور میں نے یہ پریل کو بتایا بھی تھا۔

''مم..... میں اب لائقو کو زندہ نہیں چھوڑوں گا.....'' اچانک پریل غیظ و غضب سے بولا۔ ''میں اسے معاف کرنے والا تھا جو اس نے میرے ساتھ کیا، لیکن اس مردود نے میری معصوم سونہڑیں کو چند ٹکوں کے لالچ میں دوبارہ اس کے سنگ دل اور بے رحم باپ کے حوالے کر کے اچھا نہیں کیا۔ سونہڑیں کو شدید خطرہ ہے۔ اس کا ظالم اور انا کا مارا ہوا باپ اپنی شان بچانے کے لیے غریب اور معصوم سونہڑیں کو ہلاک کر ڈالے گا۔'' پریل کو وہی دورہ پڑ گیا۔ ''میں اسی وقت جاؤں گا..... میں اب نہیں رک سکتا۔ یہ گن

مجھے دو.....'' پریل نے دل مراد سے گن جھپٹ لی۔

میں نے بھی ہتھیار کا تقاضا کیا تو شنواری نے اپنی شلوار کے نیفے سے پستول نکال کر مجھے تھما دیا۔

''میرا خیال ہے کہ سردار سائیں کا ابھی ڈیرے میں جانا مناسب نہ ہوگا۔ پہلے راز داری کے ساتھ.....'' دل مراد کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اسی وقت پریل نے اس کی بات رد کر دی اور آگے بڑھ گیا۔ ہم اس کے ساتھ تھے۔

صورتِ حال..... معاملہ فہمی سے ہٹ کر اب دوبارہ جنگ کی نہج پر آ گئی تھی۔

ڈیرے پر پہنچتے ہی پریل نے اپنی گن کا رخ آسمان کی طرف کر کے ایک عدد ہوائی برسٹ فائر کر دیا۔ مقصد اپنی آمد کا اعلان کرنا اور دشمن کو للکارنا تھا۔ اگرچہ ڈیرے میں داخل ہوتے ہی کئی اور لوگ بھی ہمارے ساتھ شامل ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں اور چہروں سے حیرت و مسرت عیاں تھی، بعض لوگ عجیب سی پریشانی اور الجھن کا بھی شکار تھے۔ کئی ڈاکوؤں نے تو پریل کو زندہ دیکھ کر اس کے حق میں نعرے بازی بھی کر ڈالی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں مجمع لگ گیا اور پریل کے وفاداروں نے ہمارے گرد گھیرا ڈال لیا تھا۔ اسی وقت لائق ماچھی بھی وہاں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ نمودار ہو گیا۔ اس خبیث کو دیکھتے ہی پریل کا مارے طیش کے جو حال ہوا سو ہوا تھا خود میرے اپنے وجود میں بھی نفرت و غیظ کی لہریں امڈ پڑی تھیں۔

پل کے پل وہاں گروہ بندی کی لائن سی آپوں آپ کھنچ گئی۔ وہ سب ہتھیار سنبھالے چوکنا کھڑے تھے۔

''ساتھیو! میں کوئی خون خرابا نہیں کرنا چاہتا.....'' پریل نے اپنے غدار نائب کو دیکھنے کے باوجود اپنے اندرونی ابال پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اس کے ٹوٹے اور ریختہ وجود میں جانے کہاں سے اچانک قوت آ گئی تھی، شاید جوشِ جذبہ اسی کو کہتے ہیں۔ پریل کا خطاب جاری تھا۔

''مجھے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت مروانے کی کوشش کی گئی اور مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس سازش کا سرخیل اور کوئی نہیں میرا اپنا ہی نائب لائق ماچھی تھا۔ لیکن اللہ سائیں کو میری زندگی ابھی منظور تھی۔ اس نے میرے دوست شہزاد احمد شہزی کو میرا نجات دہندہ بنا کر میرے پاس بھیج دیا اور اسی میرے جاں نثار دوست نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجھے بچایا۔ جس کی وجہ سے آج میں تم لوگوں کے سامنے زندہ کھڑا ہوں۔ میں نے اس آستین کے سانپ..... لائق ماچھی کو معاف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور اس بات پر بھی راضی تھا کہ بے شک جو اس کے ساتھ ملنا چاہے مل جائے اور الگ گروہ کی بنیاد ڈال دے لیکن مجھے معلوم ہوا کہ اس بدبخت نے میری ایک مقدس امانت، ایک معصوم لڑکی، جس سے میں محبت کرتا تھا اور جو اپنے ظالم باپ وڈیرے شاہنواز خان کی شان و شوکت کو ٹھوکر مار کر میرے ساتھ زندگی گزارنے کا عہد کر چکی تھی، اس غریب کو رقم کے لالچ میں اندھا ہو کر اس بدبخت غدار نے دوبارہ اس ظالم انسان کے حوالے کر دیا۔ اب میں فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں..... جو مجھے اب بھی اپنا سردار تسلیم کرتا ہے، وہ میرے دائرے میں آ جائے..... اور جو لائق ماچھی کے ساتھ ملنا چاہتا ہے وہ اس کی طرف اپنے قدم بڑھا لے، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن اس کے بعد لائق ماچھی کو اپنے جرم کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔''

پریل اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ مجمع میں ایک دم سناٹا چھا گیا تھا۔ میرے لیے یہ عجیب صورتِ حال تھی۔ بالکل ہی عجیب..... میں خود یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں کسی آتش فشاں پر کھڑا ہوں اور جس کے اندر سے کسی وقت بھی ایک خوفناک جوالا مکھی پھوٹ پڑے گا۔ تاہم مجھے پریل کی دانش مندی کا بھی اعتراف تھا کہ اس نے یہاں بھی اپنی معاملہ فہمی سے کام لینے کی کوشش چاہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ پریل کو اپنے گروہ میں اب بھی اپنی اہمیت اور حیثیت کا بغیر کسی خوش فہمی کے پورا احساس تھا۔ وہ بڑی چالاکی اور فہم و فراست سے لائق ماچھی جیسے خطرناک دشمن غدار کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ یہی سبب تھا کہ چند ہی لمحے بعد اس کے ثمرات میری آنکھوں کے سامنے تھے۔

ہمارے ساتھ جو اسلحہ بدست ڈاکو شامل ہوئے تھے، ان کی تعداد لائق ماچھی سے کہیں زیادہ تھی۔ جبکہ لائق ماچھی کے ساتھی، تعداد میں آٹے میں نمک کے برابر تھے اور جو تھے وہ بھی الجھن کا شکار ہی معلوم ہوتے تھے۔ پریل نے اپنی جان دار حکمتِ عملی سے اپنے دشمن کو تنہا کر کے رکھ دیا تھا اور اب اس کے ساتھی جیسے حکم کے منتظر تھے کہ وہ لائق ماچھی جیسے غدار کی تکا بوٹی کر ڈالتے۔ مجھے ایک بار پھر پریل کی زود فہمی اور دانش مندی کا قائل ہونا پڑا۔

''ہم تمہارے ساتھ نہیں چل سکتے..... ہم جانا چاہتے ہیں۔'' معاً خبیث لائقو نے کہا اور میں اس کی شاطرانہ مکاری پر اندر ہی اندر کھول اٹھا مگر بولا کچھ نہیں۔ ابھی یہ معاملہ مکمل طور پر پریل کے سپرد تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے پریل کو پُرطیش عالم میں اس کی طرف قدم بڑھاتے

ہوئے دیکھا اور پریل نے لائق ماچھی کے قریب پہنچ کر اس کا گریبان دبوچ لیا۔

''تجھے پہلے اپنے جرم کا حساب دینا ہوگا..... لائقو! لیکن میں اپنی زبان پر بھی قائم ہوں کہ میں نے اپنا جرم تجھے معاف کر دیا ہے لیکن..... تو نے میری سونہڑیں کے ساتھ جو قبیح اور انتہائی گری ہوئی حرکت کی ہے، اس کا تجھے ابھی حساب چکتا کرنا ہوگا۔''

''نہیں سردار سائیں.....!'' اچانک ایک ساتھی ڈاکو نے بہ آواز بلند پریل چانڈیو سے کہا۔ ''اس غدار کمینے کو تمہارا حساب بھی دینا ہوگا..... اس نے تمہاری پیٹھ میں خنجر گھونپنے کی کوشش کی ہے اور ہمیں بھی بزور دھمکی اور زبردستی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی، اس کا جرم معمولی نہیں ہے۔ اسے سزا ضرور ملنی چاہیے۔'' اس کی بات پر مجمع میں شور بلند ہوا۔

''غدار کی سزا موت..... غدار کی سزا موت.....''

ایسے ہی فیصلہ کن لمحات نے مجھے بھی اس کی جانب قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا اور میں چند قدم اٹھاتا ہوا پریل کے قریب پہنچا اور اس سے کہا۔

''پریل! اس وقت سونہڑیں کا معاملہ سب سے اہم ہے۔ ہمیں اس کے لیے جلد سے جلد کچھ کرنا ہوگا..... ابھی اس معاملے کو اِدھر ہی رہنے دو اور لائق کو قید میں ڈال دیا جائے..... اسے پھر دیکھتے ہیں.....''

پریل کو میری یہ تجویز معقول لگی اور اس نے یہی حکم دے ڈالا..... چنانچہ لائق ماچھی اور اس کے چند ساتھیوں کو ایک جھونپڑے میں رسن بستہ کر کے مقید کر دیا گیا۔ پریل کے ساتھیوں کا ارادہ، اپنے سردار سائیں کی واپسی کی خوشی میں جشن منانے کا تھا لیکن پریل نے منع کر دیا اور اسی وقت وڈیرے شاہنواز خان کی حویلی پر ہلہ بولنے کی تیاریاں کی جانے لگیں۔

سونہڑیں کی دستیابی کے علاوہ میں نے پریل سے ارم اور اس کے دونوں بچوں کو بھی اس کے قبضے سے آزاد کرانے کا ذکر خاص طور پر کیا تھا جبکہ شکیلہ بھی اسی کے قبضے میں تھی۔ مجھے یہ معلوم تو نہ تھا کہ شکیلہ کو جب زمیندار شاہنواز نے اپنے حواریوں کے ساتھ وہ طلسمِ نور ہیرا ڈھونڈنے کے لیے پرانے قبرستان کی طرف روانہ کیا تھا تو اس کا ''کھڑتیل'' کیا برآمد ہوا تھا؟ ظاہر تھا کہ وہ بھی شاہنواز کی قید میں ہی ہوگی اب..... ساتھ ہی مجھے فکر و تشویش بھی تھی کہ وہ ہیرا اس خبیث آدمی کے ہاتھ نہ لگ گیا ہو۔ کبیل دادا اور اول خیر بھی پولیس لاک اَپ میں تھے۔ ان سے متعلق بھی میں نے خاص طور پر پریل سے ذکر کیا تھا۔ پریل نے مسکرا کر مجھے اس بات کی تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

''اب کیوں فکر کرتا ہے میرے یار شہزی! وڈیرے اور اس کے راتب خور انسپکٹر رجب دین نے تیرے اور تیرے ساتھیوں کے خلاف جو غیر قانونی ہتھکنڈا استعمال کیا ہے میرے لیے وہی ہتھیار استعمال کرنا آسان ہے۔ بس، دیکھتا جا تو.....''

پریل نے اپنے چند ڈاکو ساتھیوں کا انتخاب کیا..... مجھے بھی ایک عدد کلاشنکوف تھما دی گئی۔ اس کے بعد ہم سب تیز رفتار گھوڑوں پر شاہنواز خان کی حویلی کی طرف روانہ ہو گئے۔

جنگل کی حدود سے نکل کر جب ہم شاہنواز خان کے گوٹھ کی حدود میں داخل ہوئے تو پریل نے سب کو رکنے کا اشارہ کیا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے دو ساتھی جاسوسوں کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے حویلی روانہ کر دیا۔ ہم سب وہیں موجود رہے۔ گوٹھ کی اس سمت پر کیکر کا گھنا جنگل تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ شاہنواز اتنا نچلا بیٹھے رہنے والا آدمی نہیں ہو سکتا تھا۔ حویلی پر حملے اور بیٹی کے ''اغوا'' اور لائق ماچھی کی غداری کے سبب دوبارہ اپنی بیٹی سونہڑیں کو حاصل کرنے کے بعد وہ بھی محتاط ہو گیا ہوگا۔ تاہم میرے ذہن میں ایک خیال بھی، اس کے مطمئن اور غیر محتاط ہونے کا ضرور ابھرتا تھا کہ لائق ماچھی سے ساز باز (تاوانِ زر کی صورت) کے دوران، ممکن تھا کہ اس نے شاہنواز کو بتایا ہو کہ پریل اب زندہ نہیں رہا تھا۔ میں نے جب اس کا اظہار پریل سے کیا تو وہ زہریلی مسکراہٹ سے بولا۔

''لائق ماچھی میرے متعلق یہ بات شاہنواز خان کو کبھی نہیں بتا سکتا۔ بلکہ اگر وہ یہ بتانے کی بیوقوفی کرتا تو اس کا دبدبہ کمزور پڑنے لگتا۔ اس نے تو میرا ہی نام استعمال کیا ہو گا..... کیونکہ شاہنواز کے دل و دماغ پر آج بھی میری ہی دہشت طاری ہے۔ لہٰذا لائقو نے یہی بتایا ہوگا کہ میں نے اس کی بیٹی کو تاوان کے لیے ہی اغوا کیا تھا۔'' پریل کی بات پر میں نے پُرغور انداز میں اپنی بھویں اچکا لیں۔

خاصی دیر بعد پریل کے دونوں مذکورہ جاسوس لوٹے تو انہوں نے اطلاع دی کہ شاہنواز خان کی حویلی کے گرد مسلح حواریوں کے علاوہ پولیس کے کچھ اہلکار بھی تعینات کر دیے گئے تھے۔

''پولیس متعلقہ تھانے سے تعلق رکھتی ہے یا شہر سے

بلوائی گئی ہے؟'' پریل نے ایک جاسوس ساتھی سے پوچھا۔

''وہاں کھڑی دو پولیس کی گاڑیوں کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ گوٹھ کے تھانے کی ہیں۔'' جاسوس نے جواب دیا۔

''ہوں.....'' پریل نے پُرسوچ ہنکارا بھرا۔ پولیس کے ذکر پر میری پیشانی پر بھی سلوٹیں نمودار ہوگئی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ پریل اب بھی حویلی پر چڑھائی کا ہی حکم صادر کرے گا مگر اس نے ساتھیوں کو متعلقہ تھانے پر ہلّا بولنے کا حکم دیا۔ مجھے اس کی حکمتِ عملی کے یکدم بدلنے پر حیرت تو ہوئی لیکن یہاں کے معاملات اور حالات کا مجھ سے کہیں زیادہ پریل ہی ادراک رکھتا تھا اسی لیے میں خاموش رہا۔

چنانچہ رات کی تاریکی میں ہم گھوڑوں کو درمیانی رفتار سے دوڑاتے رہے اور پھر ایک مقام پر پریل نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔

پریل نے جلد ہی میری الجھن رفع کردی اور بتادیا کہ تھانے پر دھاوا بولنے کے دو نتائج برآمد ہوسکتے ہیں..... ایک تو یہ کہ وڈیرے کی حویلی پر تعینات پولیس اسی طرف دوڑی چلی آئے گی اور دوسرا فائدہ یہ ہوتا کہ ہم کمبل دادا اور اول خیر کو چھڑا سکتے تھے۔ اس کی منصوبہ بندی تو لاجواب تھی لیکن..... میں تب بھی مطمئن نہ ہوا تھا، بولا۔

''لیکن کیا اس طرح ایک قانونی عمارت پر حملہ کرنا صورتِ حال کی خطرناکی کو بڑھانے کا سبب نہیں؟ میرا مطلب ہے.....'' میں رکا پھر بولا۔

''یار! برا مت منانا..... تمہارا معاملہ ادر ہے..... لیکن اس طرح میں اور میرے ساتھی بھی سنگین جرم کی لسٹ میں آسکتے ہیں۔'' میری بات پر پریل مسکرا کے بولا۔

''تم میرے محسن ہو شہزی! میں بھلا تمہاری بات کا کیوں برا مناؤں گا لیکن میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں..... بے فکر رہو..... ایسا کچھ نہیں ہوگا..... تم اور تمہارے ساتھی اس وقت کسی حقیقی قانون کی زد میں نہیں بلکہ جنگل کے قانون میں پھنسائے گئے ہو..... پھر اس قومی امانت (طلسمِ نور ہیرا) سے متعلق معاملہ اس سے زیادہ سنگین ہے جو صرف..... شاہنواز کے لیے ہی نہیں بلکہ خود اس راتب خور انسپکٹر رجب دین کے لیے بھی مصیبت بن سکتا ہے۔ ان پر غداری کا کیس بن جائے گا، اس حقیقت کا انہیں بھی علم ہوگا اسی لیے مجھے یقین ہے کہ تم اور تمہارے ساتھیوں سے متعلق ایسا کوئی ریکارڈ وہاں نہیں رکھا گیا ہوگا اور یہ جو کچھ تم لوگوں کے ساتھ ہوا، وہ بدمعاشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔''

پریل نے اپنی بات ختم کی تو مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ پریل ایک ڈاکو ہی نہیں بلکہ سمجھ دار انسان بھی ہے۔ اس نے مجھ سے اور میرے ساتھیوں کے متعلق حالات کا جو تجزیہ کیا تھا، وہ غلط نہ تھا۔ دشمنوں کو بھلا ایک درست بات کو غلط موڑ دینے میں کیا دیر لگتی ہے۔ مجھے سوچتا پا کر وہ میرے کاندھے کو تھپکتے ہوئے بولا۔

''فکر مت کرو دوست! یہ شاہنواز اور قانون کی وردی پہنے ہوئے رجب دین بھی جرم کی راہ پر گامزن ہیں اور خود سب سے بڑے چور ہیں۔ تم میرے ایک ساتھی کے ساتھ تھانے سے دور ہی رہنا، میں اور میرے باقی ساتھی ہلّا بول کر صرف تمہارے ہی نہیں بلکہ وہاں موجود سارے حوالاتیوں کو آزاد کردیں گے۔''

''نہیں میرا بھی تمہارے ساتھ چلنا ضروری ہے..... پریل! اپنے ساتھیوں کی رہائی کے سلسلے میں، پیچھے میں بھی نہیں ہٹوں گا۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہا اور پھر ہم آگے بڑھ گئے۔

تھانہ زیادہ دور نہ تھا۔ پریل کے کہنے پر اس کے ایک ساتھی نے میرے چہرے پر بھی اجرک کا ڈھاٹا باندھ دیا۔

سیدھی سی بات

شادی کے چند ماہ بعد شوہر نے رومان پرور موڈ میں بیوی سے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس قدر حسین ہونے کے باوجود بے وقوف کیوں ہو؟''

''کمال ہے کہ یہ سیدھی سی بات گزرے ہوئے مہینوں میں بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئی!'' بیوی نے برجستہ جواب دیا۔

''ذرا میں بھی سنوں کہ وہ سیدھی بات کیا ہے؟''

''حُسن میں میرا کوئی کمال نہیں..... اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسا ہی پیدا کیا تاکہ تم میری طرف متوجہ ہوجاؤ اور مجھ میں ذرا سی سادگی یا بے وقوفی اس لیے رکھ دی تاکہ میں تم جیسے نکمے آدمی سے شادی پر رضامند ہوجاؤں۔''

اسلام آباد سے ہما احمد کا جواب

مجھے یہ سوچ کر دل میں ہنسی آگئی کہ کیا وقت آگیا مجھ پر کہ سندھ کا ڈاکو بھی آج بننا پڑ گیا تھا مجھے۔

گوٹھ کی آبادی سے ہٹ کر ہم کیکر کے جنگل میں آگے بڑھتے ہوئے کھیتوں کھلیانوں کی طرف نکل آئے اور اس کے بعد چند فرلانگ مزید آگے بڑھے تھے کہ ہمیں مدھم سی روشنی میں ذرا ہی دور ایک پیلی سی سلگتی ہوئی عمارت دکھائی دینے لگی..... پتا نہیں یہاں اول خیر اور کبیل دادا بے چارے کن حالوں میں ہوں گے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ انہیں اپنے سے زیادہ میری اور شکیلہ کی فکر کھائے جا رہی ہو گی۔

انسپکٹر رجب دین کے شاید تصور میں بھی نہ ہوگا کہ اس نے اپنے جس راتب نواز (زمیندار شاہنواز) کی حفاظت کے لیے پورے تھانے کی اچھی خاصی نفری متعین کر رکھی تھی، اس کی ضرورت اسے بھی پڑ سکتی تھی۔

تھانے کے مین گیٹ کے سامنے مختصر سا میدان تھا، دائیں جانب کیلے کے لمبے چوڑے پتوں والے جھاڑ دار کھیتوں کے سلسلے کا آخری سرا ملتا تھا۔ بائیں جانب کیکر کا جنگل اور عقب میں قبرستان کی حدود تھی۔ پریل نے اپنے دستے کے نصف ساتھیوں کو آخر الذکر راستے سے عمارت پر نقب لگا کر پیچھے حملہ کرنے کا حکم دے کر روانہ کر دیا اور خود اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ بائیں جانب روانہ ہو گیا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ تاہم پریل نے یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ خون خرابا اور قتل کسی کا نہ ہونے پائے، بلکہ زیادہ سے زیادہ دہشت ناکی پھیلائی جائے اور اشد ضرورت یا خطرے کے پیش نظر صرف زخمی کیا جا سکتا تھا۔ تھانے کی عمارت کو بھی صرف اسی حد تک نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے کہ قیدی باہر نکل کر راہِ فرار اختیار کر سکیں.....

ان ہدایات کے تھوڑی دیر بعد ہی تھانے پر چڑھائی کر دی گئی۔ پہلا گروپ تھانے کی عقبی دیوار پھاند کر اندر جا کودا اور اس نے اچانک حملہ کر کے ہلّا بول دیا۔ جبکہ ہمارے گروپ نے کیلے کے کھیت کی جانب سے رخ کیا۔

گھوڑے ہم نے تھوڑی دور ہی باندھ دیے تھے اور ہتھیار سنبھالے پتوں کی آڑ لیے عمارت کے دائیں جانب کی دیوار سے چپک کر کھڑے ہو گئے۔ ہمیں اپنے دوسرے گروپ کی کارروائی کا انتظار تھا تاکہ مین گیٹ اور تھانے کے مرکزی راستے پر موجود پولیس اہلکار شور یا ہنگامے کی آواز پر اندر کا رخ کرتے اور وہی ہوا۔ جیسے ہی اندر شور اور ایک دو برسٹ کھڑکنے کی آواز ابھری، ہم نے مین گیٹ سے دھاوا بول دیا۔

ایک چھوٹے سے گوٹھ کا تھانہ کتنا بڑا ہو گا، اس کا اندازہ اس کی عمارت اور نفری کو دیکھ کر ہو رہا تھا۔

پریل کو رجب دین کی تلاش تھی اور مجھے اپنے ساتھیوں کی..... ہمارے سامنے چند پولیس اہلکاروں نے ڈٹ جانے کی کوشش چاہی تھی اور ہم پر انہوں نے گولیاں بھی برسا دیں۔ نتیجے میں ہمارے دو ساتھی زخمی ہو کر گر پڑے، باقی ساتھی اِدھر اُدھر آڑ میں ہونے لگے مگر پریل اور میں نے اپنی کلاشنکوفیں سیدھی کر ڈالیں اور ان پر برسٹ فائر کر دیا۔ نشانہ ان کی ٹانگیں تھیں مگر شاید کوئی بھولی بھٹکی گولی ایک سپاہی کی گردن میں پیوست ہو گئی۔

یہ پریل کے فائر کیے ہوئے برسٹ کی گولی تھی۔ اس نے اپنے دو ساتھیوں کو پولیس والوں کے ہاتھوں گولی کھا کر گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور یوں شاید بپھر کر اس نے ان پر اندھا دھند فائرنگ کر ڈالی تھی۔ وہ چاروں چیخیں مارتے ہوئے گرے اور تڑپنے لگے۔

پریل شاید انسپکٹر رجب دین کی تلاش میں مختلف کمروں میں جھانکتا رہا، مگر وہ اسے کہیں نظر نہ آیا تو اس نے ایک زخمی پولیس والے سے پوچھ لیا، اس نے بتایا..... وہ اپنے کوارٹر میں تھا۔ پریل اپنے دو ساتھیوں کو لے کر اسی طرف کو بڑھ گیا جہاں لائن سے پانچ چھ کوارٹرز بنے ہوئے نظر آ رہے تھے جبکہ میں نے حوالات کی طرف کا رخ کیا۔

پریل نے ساتھیوں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں وہ میرا حکم مانیں گے مگر مجھے کسی کو حکم دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ یہ سبھی ایک ''پلانڈ'' منصوبہ بندی کے تحت ''مصروفِ کار'' تھے۔ ایک نے حوالات کی طرف دستی بم اچھال دیا جو ساعت شکن دھماکے سے پھٹا..... ہر طرف دھواں اور بارود کی بُو پھیل گئی۔ ہمارا مقصد قتل و غارت نہیں تھا صرف ہراس پھیلانا تھا تاکہ حویلی پر تعینات کی ہوئی دوسری پولیس پارٹی اس طرف متوجہ سکے نیز ہم اپنے ساتھی اول خیر اور کبیل دادا کو بھی پولیس کے چنگل سے چھڑا سکیں اور یہ کام پریل کے ڈاکو ساتھی بڑی خوبی کے ساتھ انجام دے رہے تھے جبکہ مجھے اپنے ساتھیوں کی تلاش تھی۔

حوالات کا دروازہ ٹوٹتے ہی قیدیوں کی خاصی تعداد شور مچاتی ہوئی برآمد ہوئی۔ گھبراوہ بھی گئے تھے اس ناگہانی افتاد پر..... تاہم اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے کی انہوں نے بھی ٹھان رکھی تھی، میں نہایت بے چینی اور

دھڑکتے دل کے ساتھ اول خیر اور گبیل دادا کو تلاش کررہا تھا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آرہے تھے، ایک خیال آیا کہ کہیں وہ بھی اس افراتفری اور ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر نکل نہ بھاگے ہوں اور میری ان پر نظر نہ پڑسکی ہو۔ لیکن حوالات یا مختصر سی جیل میں قیدی ہوتے ہی کتنے ہیں؟ میں نے ایک ایک قیدی اور بھاگتے ہوئے حوالاتی کے چہرے کو غور سے دیکھا تھا۔ کیونکہ اول خیر یا گبیل دادا مجھے اس ڈھاٹے میں شاید نہیں پہچان پاتے۔

میں پریشان اور بے چین ہوگیا۔ اسی وقت گولی چلی..... اور مجھے اپنی کنپٹی کے بالکل قریب ''جھپک'' سی محسوس ہوئی۔ بس، ایک آدھ انچ کا ہی فاصلہ رہا ہوگا ورنہ میں اگلے جہاں سدھار چکا ہوتا۔ قریب سے گزرتی موت کی اس ہولناک سرگوشی نے میرا دماغ جھنجھنا ڈالا اور میں نے تیزی کے ساتھ جھکائی دے کر پلٹا کھایا تو ایک پولیس مین اپنی رائفل سے مجھے دوسری گولی ٹھونکنے کی تیاری میں تھا۔ وہ ایک کمرے کی دیوار کی آڑ میں تھا، میرے پاس فوری طور پر اس کی دوسری متوقع فائر ہونے والی گولی سے بچنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں بھی اس پر جوابی فائر کرتا لیکن ابھی میں بچنے کے لیے متحرک ہوا ہی تھا کہ کوئی بھاگتا ہوا بوکھلایا قیدی، بڑے زور سے مجھ سے ٹکرا گیا۔ وہ کم بخت خاصا بھاری بھرکم اور موٹا تازہ تھا۔ میرا توازن بگڑا اور میرے پاؤں زمین سے اکھڑ گئے۔ تب ہی مجھے قریب سے دوسری گولی چلنے کا دھماکا سنائی دیا جس میں اسی بھاگتے ہوئے مجھ سے ٹکراتے قیدی کی لرزہ خیز چیخ بھی شامل تھی۔ وہ میرے بجائے اسی پولیس والے کی گولی کا شکار ہوگیا تھا جبکہ میری بدقسمتی یہ تھی کہ میں جہاں لڑکھڑا کر گرا تھا وہاں وہی قصائی پولیس اہلکار رائفل سنبھالے کھڑا تھا جس نے دوبار مجھ پر گولی چلائی تھی۔ میں اس کے نشانے پر تھا۔ ایک اور بدقسمتی تو یہ ہوئی کہ میری کلاشنکوف بھی ہاتھ سے چھوٹ کر ذرا پرے جا گری تھی۔

اس نے اپنے شکار کو اتنے قریب اور آسان ''ہدف'' میں دیکھا تو دوبارہ مجھ پر اپنی رائفل سونت لی۔ موت کو اچانک اور غیر یقینی انداز میں اس قدر اپنے قریب پاکر میں خود ایک لمحہ کو دم بہ خود سا رہ گیا اور یہ سوچتا ہی رہ گیا تھا کہ میرے ساتھ تقدیر نے یہ کیسا مذاق کیا تھا کہ مجھے ایک طرف موت سے بچایا بھی اور دوسری طرف پل کے پل اجلِ بے رحم کے دہانے پر گرا بھی دیا۔ تیسری گولی چلی تھی اور مجھے اسی پولیس اہلکار کی کریہہ انگیز چیخ سنائی دی۔ میں زندہ تھا اور تقدیر کو میں نے غیر مرئی نگاہوں سے مسکراتے دیکھا، اب ہی میں پھرتی کے ساتھ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ وہ پریل تھا، جو نجانے وہاں اچانک کب اور کیسے نمودار ہوا تھا کہ اس نے مجھے اس پولیس اہلکار کے نشانے پر دیکھ کر اسے اپنی گن سے نشانہ بنا ڈالا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو ناں.....؟'' اس نے میرے قریب آکر پوچھا۔ ''میں نے اصل کام نمٹا دیا ہے۔ اس رذیل انسپکٹر رجب دین کو دھمکا کر میں نے حویلی سے باقی نفری بلوالی ہے۔ اب اس سے پہلے کہ وہ یہاں پہنچیں، ہمیں حویلی کی طرف چلنا ہوگا۔ اور یہ تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟''

میں نے فکر و تشویش سے کہا۔ ''پرو! میں ابھی تک انہیں ڈھونڈ رہا ہوں..... وہ کہیں نظر نہیں آرہے ہیں.....''

پرو میری بات پر چونکا۔ کچھ سوچا۔ اس کے بعد مجھے چند جملوں میں تسلی دی اور پھر اپنے ساتھیوں کو واپسی کا حکم دیا۔ پھر مجھ سے بولا۔

''آؤ میرے ساتھ.....'' کہہ کر وہ پھرتی سے پلٹا، میں حیران و پریشان اس کے پیچھے ہولیا۔ وہ مجھے لیے تھانے کے احاطے میں اس جگہ پر آگیا جہاں لائن سے چند کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک میں جا گھسا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ اندر ایک کمرے میں انسپکٹر رجب دین رسن بستہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ وہ کافی خوف زدہ نظر آرہا تھا۔ پریل نے خوف ناک انداز میں اسے گھورتے ہوئے اس کی پیشانی پر اپنی کلاشنکوف کی نال رکھ دی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پہ خوف اتر آیا..... وہ گھگیا کر بولا۔

''مم..... مجھے مت مارو..... میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں..... میں نے تمہاری ہر بات مان لی ہے۔''

''بکواس بند کر اپنی.....'' پرو چانڈیو حلق کے بل دہاڑا اور پھر اس نے اول خیر اور گبیل دادا کے بارے میں پوچھا تو رجب دین نے میری جانب دیکھا۔ میرا چہرہ اگرچہ اجرک کے ڈھاٹے میں ملفوف تھا لیکن رجب دین کو مجھ پر اس سوال کے بعد شبہ ہونا عین فطری امر تھا۔ اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

''مم.....''

''خبردار.....! جھوٹ مت بولنا.....'' پرو دہاڑا۔ ''میں تصدیق کیے بغیر نچلا نہیں بیٹھوں گا۔ یہ بات یاد رکھنا جھوٹ بولنے سے پہلے۔''

پرو کے اس طرح پیشگی ''وارن'' کرنے پر بالآخر انسپکٹر رجب بولا۔ ''وہ..... وہ دونوں اس کے ساتھ والے

کوارٹر میں موجود ہیں.....'' یہ بتاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر پرو کے چہرے سے اپنی نظریں ہٹاتے ہوئے میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھا تھا۔ میں بے چین تھا۔ پرو پلٹا اور مجھے بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

ابھی اس کوارٹر سے باہر نکلنے بھی نہیں پائے تھے کہ اچانک باہر فائرنگ کی آواز سنائی دی ساتھ ہی ایک سے زائد گاڑیوں کی آوازیں بھی ابھریں..... میں اور پریل یہی سمجھے تھے کہ حویلی والی نفری یہاں آن پہنچی تھی۔ لیکن..... جب ہم نے دروازے سے باہر ذرا جھانکا تو میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں..... تھانے کے احاطے میں..... اور باہر رینجرز کی وردی میں ملفوف مسلح نوجوان پرو کے واپس لوٹتے ہوئے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ان کے پاس مخصوص اونچے اور چوڑے ٹائروں والی جیپیں تھیں۔ وہ سب جدید ہتھیاروں سے لیس تھے۔

''اینٹی ڈکیت فورس.....''

معاً ہی ساتھ کھڑے پرو چانڈیو کو میں نے زیرِلب بڑبڑاتے پایا۔ میں نے دیکھا اس کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا تھا۔ میں خود بھی اس نئی صورتِ حال سے پریشان ہوگیا تھا۔ یہ کوئی عام فورس نہ تھی۔ رینجرز کے انتہائی تربیت یافتہ اہلکار تھے۔ پتا نہیں کیسے انہیں اطلاع دی گئی تھی یا پھر یہ لوگ پہلے سے ہی کسی ''آپریشن کلین اَپ'' میں مصروف تھے۔ ان کے اندر مختلف ونگس کام کرتے تھے۔ ان میں قابلِ ذکر ''لاء انفورسمنٹ''، ''پاور'' (جو اَب ڈراپ کی جاچکی تھی اور اس ونگ میں، میں خود بھی شامل تھا، بعد میں اول خیر اور شکیلہ بھی)، اینٹی ٹیررسٹ ونگ'' اور اینٹی ڈکیت ٹاسک فورس'' تھیں۔

''شہزی! ہوشیار..... ہمارا اب باہر نکلنا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ یہ کوئی عام پولیس فورس نہیں ہے۔''

اب اسے کیا پتا تھا کہ اس سے زیادہ میں یہ حقیقت جانتا تھا۔ میں خود کئی سال پہلے رینجرز کے ایک خصوصی اور خفیہ ونگ ''پاور'' کا ایک تربیت یافتہ ایجنٹ رہ چکا تھا۔ تاہم بولا۔

''او..... اس کا مطلب ہے ہم خطرے میں گھر گئے ہیں..... میرے ساتھیوں کا کیا بنے گا؟ وہ ساتھ والے کوارٹر میں قید ہیں۔'' (بقول انسپکٹر رجب دین کے)

''میرے اپنے ساتھی بھی اس وقت اینٹی ڈکیت فورس کے نرغے میں آئے ہوئے ہیں، مجھے ان کی مدد کو جانا ہوگا.....'' پرو لرزتے لہجے میں بولا۔ ''تم اس کوارٹر کی چھت پر جا کر ساتھ والے کوارٹر میں ٹاپ جاؤ..... مجھے ان سے مقابلہ کرنا ہوگا۔'' وہ یہ کہہ کر باہر نکلنے لگا مگر میں نے اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''پرو! میرے یار! تو ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یہ لوگ انتہائی تربیت یافتہ.....'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ پرو میرا ہاتھ جھٹک کر یہ کہتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

''میں اپنے ساتھیوں کو ان کے رحم و کرم پہ نہیں چھوڑ سکتا.....''

میں اپنی جگہ ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ باہر گولیوں کی بھیانک تڑابڑی جاری تھی۔ میں تیزی سے کوارٹر کی چھت پر جا پہنچا۔ مجھے بار بار..... یہ خدشہ ستا رہا تھا کہ اگر میں یا میرا کوئی ساتھی اینٹی ڈکیت فورس کے ہتھے چڑھ گیا تو ان پر سنگین مقدمہ بھی قائم ہوسکتا تھا اور وہ ہمیں بھی ان ڈاکوؤں کا ساتھی ہی سمجھیں گے جبکہ باقی کی کسر انسپکٹر رجب دین اور وڈیرا شاہنواز پوری کرنے کے لیے کافی ہوتے۔

ان اندیشوں نے مجھے..... سرتاپا لرزہ سا دیا اور میں تیزی کے ساتھ چھت کی دیوار ٹاپ کر دوسرے کوارٹر کی چھت پر چھلانگ لگانے ہی والا تھا کہ مجھ پر باہر کہیں سے ایک برسٹ فائر ہوا..... زندگی باقی تھی کہ بچ گیا۔ وگرنہ تو اس برسٹ نے میرا سر اُڑا دینا تھا۔ گولیوں کی پوری باڑھ کو میں نے اپنے سر کے اوپر سے گزرتے دیکھا تھا جس کی ہولناک آتشیں جھپک بھی مجھے صاف محسوس ہوئی تھی۔ یہ بات خطرے سے کم نہ تھی کہ میں بھی رینجرز فورس کی نظروں میں آگیا تھا۔

دوسرے کوارٹر کی چھت ٹاپ کر تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا..... نیچے آیا اور کھلے صحن میں آکر دیکھا یہاں دو ہی کمرے تھے۔ ایک کا دروازہ کھلا ہوا تھا، وہ کمرا خالی تھا جبکہ دوسرے کا بند تھا۔ میں ابھی اسی کمرے کا دروازہ توڑنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا کہ اچانک داخلی دروازہ ایک زبردست دھڑاکے سے ٹوٹ کر گرا اور کئی مسلح رینجرز اہلکار اندر گھس آئے۔

''خبردار.....! حرکت مت کرنا..... ورنہ گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔'' ان میں سے ایک نے درشت اور رعب دار آواز میں کہا اور میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ مجھے حکم دینے والا ایک دراز قامت اہلکار تھا۔ وہ کیپٹن کی وردی میں ملفوف تھا۔

''گن پھینک کر اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر لو.....''

میں نے فوراً حکم کی تعمیل کر ڈالی اور ساتھ ہی اپنے چہرے سے اجرک کا ڈھاٹا بھی اتار دیا۔ کیپٹن کا لب ولہجہ پنجابی اردو تھا۔

''کیپٹن آصف صاحب! میں ان ڈاکوؤں کا ساتھی نہیں ہوں اور اندر اس کمرے میں میرے ساتھی.....''

''شٹ اَپ.....'' کیپٹن آصف نے مجھے بری طرح جھڑک دیا۔ اس کے سرخ رنگ کے چیسٹ ٹیگ پر اس کا نام کیپٹن آصف بٹ میں دیکھ چکا تھا۔ وہ ایک میری ہی عمر کا نوجوان تھا۔ چہرہ گورا چٹا اور کلین شیو تھا۔ جسم کی ساخت مناسب تھی۔ قدوقامت بھی ٹھیک ہی تھا۔

مجھے گرفت میں لے لیا گیا تھا۔ میری جامہ تلاشی بھی لی گئی۔ مجھے بولنے نہیں دیا جارہا تھا اور میں جانتا تھا کہ میں ان کے سامنے ابھی اپنی مرضی سے کچھ بول بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ مجھے ڈاکوؤں کے گروہ کا شاید سرغنہ ہی سمجھے ہوئے تھے۔

کیپٹن آصف نے دو اہلکاروں کو مذکورہ کمرے کا دروازہ بھی کھولنے کا حکم دیا۔ میری دھڑکتی نظریں بھی اس پر جمی ہوئی تھیں..... دروازہ توڑ دیا گیا اور اندر سے کبیل دادا اور اول خیر کو بھی باہر نکالا گیا۔ وہ دونوں مجھے دیکھ کر بری طرح چونکے تھے۔ ساتھ ہی اس نئی صورتِ حال پر ان کے بشروں سے تشویش آمیز حیرانی بھی مترشح ہونے لگی تھی۔ انہیں بھی بولنے سے سختی کے ساتھ منع کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہماری آنکھوں پہ پٹیاں باندھ دی گئیں۔ یہ ہمیں بازوؤں سے پکڑے باہر لے آئے۔ فائرنگ کی گھن گرج معدوم ہو چکی تھی۔ کسی اہلکار کو میں نے مؤدبانہ انداز میں کیپٹن آصف سے یہ کہتے سنا۔

''سر! آپریشن کلیئرڈ..... بہت سے ڈاکوؤں کا قلع قمع کر دیا گیا ہے۔ کئی پکڑے گئے ہیں۔ ان کا سرغنہ بھی مارا گیا ہے.....''

اس آخری بات پر میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا، کرب اور تاسف کی ایک لہر سی میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔

''سرغنہ سے تمہاری مراد پریل چانڈیو ہی ہے..... مختیار احمد؟'' مجھے کیپٹن آصف کی تحکمانہ آواز سنائی دی۔

''یس سر!'' اس کے ماتحت نے مؤدبانہ کہا۔ ''ہم نے ان کے گرفتار شدہ ساتھی سے تصدیق کروالی ہے اور تصویر سے میچ بھی کر لیا ہے۔''

میرے اندر کرب و درد..... کی لہر کسی تیز دھار خنجر کی طرح مجھے چرکے لگائے جارہی تھی اور میری آنکھوں کے سامنے بدنصیب سونہڑیں کی معصوم صورت گردش کرنے لگی۔

''یہ بھی مجھے اس کا نائب لگتا ہے۔ اس سے بھی تصدیق کر لینا چاہیے، آگے بڑھو.....'' کیپٹن آصف کی آواز ابھری۔

ہم آگے بڑھے۔ چند قدم ان کے سہارے چلنے کے بعد رک گئے۔ میری آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔ جبکہ کبیل دادا اور اول خیر کی آنکھوں میں ہنوز پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ پٹی ہٹتے ہی..... میں نے خود کو رینجرز فورس کی خاصی تعداد کے درمیان پایا۔ ان کے ہاتھوں میں جدید گنیں تھمی تھیں۔ کچھ ڈاکو بھی ان کی گرفت میں تھے۔ یہ تھانے کا وسیع احاطہ تھا۔ وہاں لاشیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ ایک لاش کو دیکھ کر میری روح تک رنجور ہو گئی، اس کے پیٹ پر گولیوں کا پورا مہیب برسٹ فائر کیا گیا تھا، جس کے باعث انتڑیاں باہر کو ابل پڑی تھیں۔ وہ پریل چانڈیو کی لاش تھی..... اس پریل چانڈیو کی جو ان رینجرز والوں کی نظروں میں بے شک ایک خطرناک اشتہاری ڈاکو رہا ہوگا، مگر اس کی اصل اور دردناک کتھا سے کوئی نہیں واقف تھا۔ اسے گولیوں کا نشانہ بنانے والوں کے پاس بھلا کب اتنا فالتو وقت ہوگا کہ..... وہ اس سے پوچھتے کہ تمہیں ڈاکو بنانے میں کس کا ہاتھ تھا؟ ان لوگوں کا، جو شرفا کے بھیس میں اس دوغلے معیار کے سماج میں اس سے زیادہ کریہہ اور خطرناک ڈاکو بنے بیٹھے ہیں..... یا وڈیرے شاہنواز خان کا..... جو ملک کا غدار تھا جس نے ایک قومی امانت چوری کی تھی اور پریل جیسے ایک غریب اور نیک سیرت ہاری کو اپنے روایتی جبر تلے کچل کر ڈاکو بننے پر مجبور کر ڈالا تھا یا پھر قانون کی وردی میں اس راتب خور پولیس انسپکٹر رجب دین کا..... جس کے پاس پریل انصاف مانگنے آیا تھا اور الٹا اسے ہی دھتکار کر نکال دیا گیا تھا۔ اس لیے کہ پریل ایک غریب ہاری (کسان) کا بیٹا تھا؟

''پہچانو اسے..... کیا یہی تمہارا سرغنہ پریل چانڈیو ہے.....؟'' معاً کیپٹن آصف نے مجھے تحکمانہ درشتی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یہ میرا سرغنہ نہیں تھا اور نہ ہی میں ان کا کبھی ساتھی رہا ہوں..... کیپٹن آصف صاحب!''

پل کے پل میرے لب ولہجے میں ایک عجیب طرح کا جوش اور دبدبہ امڈ آیا تھا۔

''اے مسٹر! اپنی آواز نیچی اور لہجہ مدھم رکھو..... سمجھے

تم.....؟'' کیپٹن آصف نے درشت لہجے میں مجھ سے کہا تو میں..... دوبارہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بدستور اسی کھنڈی ہوئی متانت اور لب و لہجے میں بولا۔

''کیپٹن صاحب! آپ مجھے بولنے کا کوئی موقع دیں گے تو میں کچھ اپنے بارے میں تفصیل بتا پاؤں گا کہ میں.....''

''بکواس بند کرا پنی..... اور جو پوچھا گیا ہے اس کا جواب دو صرف.....'' اس خرانٹ رینجرز آفیسر نے پھر میری بات کاٹی تو میں نے بھی اسی روانی سے کہا۔

''میں آپ کے سوال جواب دے چکا ہوں۔''

''یہ پریل چانڈیو ہی کی لاش ہے؟''

''ہاں۔''

''کلیئر۔''

اسی وقت دو تین رینجرز اہلکاروں کچھ پولیس کے آدمیوں کے ساتھ انسپکٹر رجب دین وہاں آ گیا اور ہماری طرف دیکھتے ہی وہ کیپٹن آصف سے بولا۔

''یہ تینوں بہت خطرناک مجرم ہیں سر! میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ سخت طیش میں نظر آ رہا تھا اور بڑی کھا جانے والی نظروں سے ہماری طرف گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

''آپ کی بروقت آمد سے..... یہ تینوں بھی گرفت میں آ گئے..... یہ بہت اچھا ہوا، اپنے مجرم ساتھیوں کو قانون کی حراست سے چھڑانے کے لیے اس خطرناک مجرم نے صوبائی شہرت یافتہ ڈاکو پرو چانڈیو کی مدد لی تھی اور تھانے میں دھاوا بولنے کا سنگین جرم بھی کیا ہے۔'' اس نے آخر میں میری جانب اشارہ کیا تھا۔ وہ ایک خفیہ ''ایجنڈے'' کے تحت، ہم تینوں کے لیے بار بار ''خطرناک'' کا لفظ بڑی روانی کے ساتھ استعمال کر رہا تھا۔

''او کے.....!'' کیپٹن آصف نے کہا۔ ''ہمیں زمیندار شاہنواز صاحب نے پہلے ہی سے بتا رکھا تھا کہ ان کی بیٹی کے اغوا میں بھی انہی کا ہاتھ تھا۔ بہرحال ہمیں کیس سے متعلق مزید بریفنگ درکار ہے۔''

''سر! آپ میرے کوارٹر میں تشریف لائیں..... میں آپ کو کیس سے متعلق ہی نہیں بلکہ مزید سنسنی خیز تفاصیل سے بھی آگاہ کر دوں گا..... تھانے کی حالت تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں.....''

مجھے معلوم تھا کہ رجب دین انہیں کیا اور کس قسم کی ''تفصیلی'' بریفنگ دینے والا تھا۔ تاہم میں خاموش رہا تھا۔ کبیل دادا اور ادل خیر بہت زیادہ فکرمند اور تشویش زدہ نظر آ رہے تھے۔ خود میں بھی کم پریشان نہ تھا۔

اگلے چند گھنٹوں بعد ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ کر گاڑیوں میں سوار کرا دیا گیا اور روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

صورتِ حالات ایک دم گمبھیر اور اس سے زیادہ سنگین ہو چکی تھی۔ رینجرز فورس سے جان چھڑانا اتنا آسان نہ تھا اس پہ مستزاد..... پولیس انتظامیہ بھی ہمارے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ خطرناک اور صوبائی شہرت یافتہ بدنام ڈاکوؤں کے گروہ سے الحاق کا الزام اس پر سوا تھا.....

اس ساری خوں ریز کشاکشی میں شاہنواز خاں، جو اس کا اصل سبب بنا تھا، مجھے اس کی قسمت بڑی یاور محسوس ہوئی تھی۔ وہ کم بخت اس سارے بکھیڑوں میں بڑے آرام سے نہ صرف دودھ میں بال کی طرح نکل کر صاف بچ نکلا تھا بلکہ معزز اور مظلوم بھی کہلایا جانے والا تھا۔ وہ اب ہر طرح کا گل کھلانے کے لیے آزاد تھا۔ اس کا سب سے بڑا دشمن پرو چانڈیو اینٹی ڈکیت فورس کے ہاتھوں مارا گیا تھا جس کا مجھے جتنا بھی افسوس ہوتا، وہ کم ہی تھا۔ شکیلہ اور ارم اس کے قبضے میں تھیں۔ طلسمِ نور ہیرے تک اس کی رسائی ہو چکی تھی یا ہونے والی تھی۔ اس کی بیٹی سونہڑیں اس کے پاس پہنچا دی گئی تھی۔ پرو چانڈیو کے گروہ کا تقریباً قلع قمع ہو چکا تھا اور ہم قانون کی گرفت میں آ چکے تھے۔ کیپٹن آصف کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ صوبائی شہرت یافتہ بدنام زمانہ ڈاکو پریل چانڈیو کی سرکوبی کے لیے اینٹی ڈکیت فورس پہلے ہی سے سرگرم تھی اور یہ معاملہ اس وقت خراب ہوا ہو گا جب اس لالچی لائق ماچھی نے سونہڑیں کے سلسلے میں تاوانِ زر کا مطالبہ وڈیرے شاہنواز خان کے سامنے رکھا تھا۔ شاہنواز کی زیرک دماغی کا تو مجھے پہلے ہی اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ کتنا شاطر انسان تھا جس نے ایک خاص مقصد کے تحت ہی لائق ماچھی کو خاموشی سے زرِ تاوان ادا کر کے اسے اندھا کر ڈالا ہو گا اور پھر کسی طرح اس کے خفیہ ٹھکانے کی مخبری بھی کر لی ہو گی۔ سو اس نے ہی رینجرز کو کسی طرح اس خطرے سے آگاہ کر دیا ہو گا کہ جس خطرناک ڈاکو کی تلاش میں قانون نافذ کرنے والے ادارے پیچھے لگے ہوئے تھے وہ اِدھر ہی کے جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔ وغیرہ.....

پیش آمدہ حالات کے مطابق میرے تجزیے کم ہی غلط ثابت ہوئے تھے۔

بہرحال..... کم و بیش آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد گاڑیاں رک گئیں۔ ہمیں نیچے اتارا گیا۔ چند ایک

دروازے اور گھومتی راہداریاں پار کرنے کے بعد شاید ہم کسی کمرے میں آ گئے تھے۔

اس کے بعد میری آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔ چند ثانیے تو میری آنکھوں کے سامنے سیاہ دھبے سے لہرانے لگے اس کے بعد میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوا تو مجھے یہ کمرا ماسوائے انسانوں کے ہر شے سے عاری ہی نظر آیا۔ یعنی فرنیچر نام کی کوئی شے وہاں نہیں تھی۔ کبیل دادا، اول خیر اور مجھے ایک ساتھ قطار میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ کیپٹن آصف دھیمی آواز میں ایک نائب سے کچھ کہنے کے بعد کمرے سے نکل گیا تھا، اس کے ہمراہ چند دیگر اہلکار بھی چلتے بنے تھے۔

اب کمرے میں تین رینجرز اہلکار ہمارے ساتھ موجود تھے۔ ہمارے دونوں ہاتھ پشت کی جانب باندھ رکھے تھے۔ ہمیں آپس میں باتیں کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ وہ تینوں اہلکار خاموش تنے کھڑے تھے، جیسے اپنی ڈیوٹی کا ایک اہم حصہ بنے ہوئے ہوں۔

کمرے میں روشنی تھی۔ ایک روشندان بھی تھا۔ چھت قدرے بلند تھی۔ ایک اندازے کے مطابق رات آدھی سے زائد بیت چکی تھی اور ہمیں یہاں لائے ہوئے مشکل سے بیس پچیس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ اچانک دروازہ کھلا اور میں نے اس طرف دیکھا۔

پانچ افراد اندر داخل ہوئے۔ ان میں ایک تو کیپٹن آصف ہی تھا۔ دوسرا اس کا بھی کوئی بڑے رینک کا افسر معلوم ہوتا تھا۔ وہ میجر کی مخصوص وردی میں تھا اور میں نے سب سے پہلے اس کے سینے پر لگے ٹیگ میں نام پڑھا۔ میجر وسیم بھٹی اس کا نام تھا۔ اس کی عمر کا مجھے چالیس پینتالیس سال کا اندازہ ہوا تھا۔ چہرہ بارعب تھا۔ جسم خاصا مضبوط اور کسرتی تھا، قد کا بھی میری طرح دراز تھا۔ شانے بھی چوڑے تھے۔ آنکھیں البتہ چھوٹی تھیں۔ چہرہ کلین شیو تھا۔ اس نے سرخ رنگ کی مخصوص رینجرز کیپ پہن رکھی تھی۔ اس کے جسم پر بھی کیپٹن آصف کی طرح رینجرز والی مخصوص وردی تھی۔

تیسرا اپنی مخصوص پولیس وردی اور اس کے شولڈرز پر لگے ستاروں سے ڈی ایس پی دکھائی دیتا تھا۔ گویا پولیس انتظامیہ بھی تفتیش کے لیے ان کے ساتھ بہ نفسِ نفیس موجود تھی۔ اس کا نام سبھاگو خاں نظر آیا تھا مجھے۔ اس کے چہرے پر پولیس والوں کی سی روایتی سخت گیری اور کرختگی مترشح تھی۔ یہ قدرے بھاری اور موٹی جسامت کا آدمی تھا۔ عمر چالیس پینتالیس سے متجاوز ہی لگتی تھی۔ ناک موٹی تھی اور رنگت چہرے کی سیاہ مائل تھی۔ چہرہ جسم کی طرح ہی چربیلا سا نظر آتا تھا جو اس کی موٹی گردن سے ہم آہنگ ہی محسوس ہوتا تھا۔ قد درمیانہ تھا۔ میں نے فقط اسی آدمی کے ہی چہرے کے تاثرات سے صاف طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ ہم تینوں کو کچھ زیادہ ہی عصیلی اور برہمانی نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ باقی دو افراد جو اِن ''افسران'' کے پیچھے تھے، ان میں سے ایک پولیس مین تھا اور دوسرا رینجرز کا آدمی.....

ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک بار پھر دروازے سے چند افراد نمودار ہوئے۔ لباس سے یہ کوئی ملازم ٹائپ ہی نظر آتے تھے۔ ان دونوں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں دو دو کرسیاں تھام رکھی تھیں۔ جو اندر لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ اس کے بعد وہ تینوں افسران اس پر براجمان ہو گئے۔ چوتھی کرسی خالی تھی۔ اس پر کوئی ڈیوائس رکھ دی گئی تھی۔ یہ ایک آڈیو ریکارڈنگ ایویڈنس تھا۔ جب میں رینجرز میں ایک ''پاور ایجنٹ'' تھا تو ایسے آلات میری نظروں سے گزرے تھے۔

میری فہم و فراست اور عقل سلیم بتاتی تھی کہ ہم تینوں کے سلسلے میں کیپٹن آصف نے انہیں ضرور کوئی ایسی بات بتائی ہے جس کی بنا پر ہمیں دیگر مجرموں (ڈاکوؤں) سے الگ کر کے یہاں بند کمرے میں تفتیش کا یوں خاص بندوبست کیا گیا تھا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ انسپکٹر رجب دین نے ہی آخر میں کیپٹن آصف کو ہمارے سلسلے میں کچھ ''خاص'' بتایا ہو..... میں ذہنی طور پر اب ہر قسم کی تفتیش اور حالاتِ وگرگوں کو فیس کرنے کے لیے بالکل پُراعتماد اور تیار تھا۔

''کیا نام ہے تمہارا.....؟'' میجر وسیم بھٹی نے میرے چہرے پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے سوال کیا۔ اس کا لہجہ بھاری اور رعب دار تھا۔

''شہزاد احمد خان شہزی.....'' میں نے جواب دیا۔

''تم کہاں کے رہنے والے ہو.....؟''

''پنجاب، ملتان.....''

''ڈاکوؤں کے اس خطرناک گروہ، جو پریل عرف پرو..... چانڈیو کے نام سے بدنام صوبائی شہرت رکھتا تھا۔ کیا تعلق تھا تمہارا اس کے ساتھ.....؟''

''میں اس کا گروہی ساتھی نہیں تھا مگر میری اس کے ساتھ دوستی کی نہج بھی بہت قلیل عرصے پر محیط رہی تھی۔''

''شکل و صورت اور گفتار سے تم ایک پڑھے لکھے شخص دکھائی دیتے ہو مگر ایک خطرناک سرغنہ ڈاکو سے تمہاری راہ و رسم کس طرح پیدا ہو گئی۔ اپنے بارے میں تفصیل

بتاؤ.....''

میں نے اس بھلے مانس میجر کے اس سوال پر دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے کا موقع فراہم کیا۔ تاہم میں ڈی ایس پی سبھا گوخان کے سلسلے میں شکوک کا شکار تھا لہٰذا میجر وسیم بھٹی سے ریکویسٹ کرنے کے انداز میں بولا۔

''سر! میں کون ہوں کیا ہوں..... یہ میں آپ کو سب سچ سچ بتادوں گا اور مجھے بتانا ہی پڑے گا۔ میرا وعدہ ہے کہ میں اس کے ٹھوس شواہد بھی آپ کے سامنے لانے کی کوشش کروں گا..... فقط میری ایک گزارش ہوگی جو پوری کردی جائے تو میں آپ کا بے حد ممنون رہوں گا.....''

''کیسی گزارش.....؟'' میجر وسیم نے بہ دستور میرے چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''سر یہ بہت ہی خفیہ اور اہم معاملہ ہے۔ آپ کا چونکہ پاک آرمی سے تعلق ہے..... اسی لیے..... مجھے ڈر ہے کہ مقامی سطح پر اس کے لیک آؤٹ ہونے کا خدشہ رہے گا..... اسے آپ ایک ملٹری سیکریٹ سروس کا راز سمجھ لیں..... یا قومی سلامتی کا معاملہ.....''

لفظ ''مقامی سطح'' کا ادا کرتے ہوئے میں نے اس کے ساتھ بیٹھے ڈی ایس پی سبھا گوخان کی طرف دیکھ کر دانستہ ادا کیا تھا۔ میری بات پر میجر وسیم اور کیپٹن آصف کے چہروں پہ ایک دم سنجیدگی کھنڈ آئی تھی۔ دونوں نے ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

''اپنی بکواس بند کرو تم.....'' معاً ہی ڈی ایس پی سبھا گوخان پُرطیش انداز میں بولا۔ ''تم ایک ڈاکو ہو..... اور ایک بدنام صوبائی شہرت یافتہ خونی ڈاکو پروچانڈیو کے قریبی ساتھی بھی..... ہمیں چکر دینے کی کوشش مت کرو.....'' یہ کہہ کر اس نے اپنے قریب بیٹھے میجر وسیم بھٹی سے کہا۔

''میجر صاحب! اسے آپ ہمارے حوالے کر دیں..... یہ بہت چالاکی سے کام لے رہا ہے۔ ایک سیدھے سادے معاملے کو خوامخواہ..... الجھا کر سیریس بنا رہا ہے، تاکہ آپ کی توجہ ایک خطرناک مسئلے سے ہٹا کر اپنا مقصد حاصل کرسکے۔''

''ڈپٹی صاحب! جس معاملے کا میں ذکر کرنے والا ہوں وہ اس سے بھی زیادہ خطرناک اور اہم نوعیت کا ہے۔'' میں نے اس کی جھڑکی کی پروا کیے بغیر کہا۔ وہ دوبارہ غصیلے لہجے میں مجھ سے مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میجر وسیم نے اسے ٹوکا۔

''ڈی ایس پی صاحب! ہم اتنے پاگل یا بے وقوف نہیں ہیں کہ اس کی باتوں میں آجائیں گے..... یہ جن ٹھوس شواہد کی باتیں کررہا ہے، وہ اگر ہمیں دکھانے میں ناکام رہا تو اس پر قانون کو جھانسا دینے کا بھی سنگین ترین کیس داخل کردوں گا میں.....''

میں جانتا تھا کہ یہ بات میجر صاحب نے صرف ڈی ایس پی سبھا گوخان کو ہی سنانے کے لیے نہیں کہی تھی بلکہ مجھے بھی در پردہ خبردار کیا تھا۔

''آپ برائے مہربانی تھوڑی دیر کے لیے میرے کمرے میں جاکر تشریف رکھیں..... اگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی جو ملٹری سیکریٹ سروس کے اہم رازوں کا حصہ بنتی ہو تو میں آپ کے گوش و گزار بھی ضرور کروں گا..... بہ صورتِ دیگر میں اسے مکمل طور پر اپنی تحویل میں رکھوں گا.....''

میجر وسیم کی بات پر ڈی ایس پی سبھا گوخان نے ناک بھوں تو بہت چڑھائی مگر اسے جاتے ہی بنی تھی۔

''ہاں! مسٹر شہزی! اب بولو.....'' ڈی ایس پی کے کمرے سے جاتے ہی میجر وسیم میری طرف متوجہ ہوکر بولا۔ ''لیکن..... ایک بات یاد رکھنا..... اگر تم نے جھوٹ بولا یا کوئی اور چکر چلانے کی کوشش کی تو تمہارا کیس میں عام عدالت سے خصوصی کورٹ میں منتقل کردوں گا جو ایسے مجرموں کو بہت خطرناک سزائیں دیتا ہے۔''

میں نے میجر وسیم کی بات پر پورے اعتماد کے ساتھ اپنا سر ہلا دیا۔ اس کے بعد پھر میں نے ذرا بھی بس نہ کی، شروع سے آخر تک ساری داستان اسے پوری تفصیل سے سنا ڈالی۔ یہاں تک کہ میجر ریاض باجوہ جو میری تازہ اطلاع کے مطابق کرنل کے عہدے پر فائز ہوچکے تھے۔ ان کے ''پاور'' ونگ، وزیر جان سے لے کر چوہدری ممتاز، اسپیکٹرم اور طلسم نور ہیرے سے لے کر..... بشام چھلگری کی موت اور یہاں تک کے سارے واقعات بلاکم وکاست سنا ڈالے۔ باوصف ان ساری باتوں اور حقائق کے میرا جو اصل اور اہم تعارف تھا، وہ میرا اپنا باپ تھا۔ جس کا ملکی ہیرو اور گمنام سپاہی کا اعتراف سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر بڑی دھوم دھام سے کیا گیا تھا۔ یہی نہیں آج جو بھارت کا خطرناک جاسوس جو وطنِ عزیز میں انارکی پھیلانے کی غرض سے داخل ہوا تھا۔ سندر داس سکسینہ..... اسے بھی میں نے ہی گرفت میں لیا تھا۔ اس پر کیس چل رہا ہے.....

یہ وہ باتیں تھیں جو بذاتِ خود ایک ٹھوس شواہد کا درجہ رکھتی تھیں۔ اس لیے... اس میں جھوٹ کی کوئی گنجائش ہو ہی

نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ اتنی بڑی باتیں بغیر شواہد کے کبھی نہیں کی جاسکتی تھیں۔

میں نے دیکھا..... میجر وسیم بھٹی اور آصف بٹ کے چہروں پہ سناٹے سے گھل گئے۔ وہ جیسے اپنی کرسیوں پہ بیٹھے بیٹھے کہیں دور کھو گئے تھے۔ لیکن ان کی یک ٹک نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں مرحلہ وار آخر میں سونہڑیں اور پریل کے بارے میں بھی بتادیا تھا۔

''جناب! میری آپ سے پُرزور گزارش ہے.....'' میں نے ان دونوں ذمّے دار افسران کی طرف دیکھ کر پھر کہا۔

''مجھے اپنی فکر نہیں ہے، لیکن اس قومی امانت کے کھو جانے کا مجھے بے حد قلق ہے جسے حاصل کرنے کے لیے میں نے انڈیا اور انڈیمان کے تاریخی اور ہولناک جزائر کا پُرخطر سفر طے کیا اور اپنی جان جوکھم میں ڈال کر یہاں پہنچا تو زمیندار شاہنواز خان کے چنگل میں پھنس گیا۔ وہ بہت بارسوخ آدمی ہے۔ اس نے متعلقہ تھانے کے انسپکٹر رجب دین کو بھی خرید کر رکھا ہے۔ وہ بھی اس کے ساتھ ملا ہوا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس بدبخت نے بریفنگ کی آڑ میں کیپٹن آصف صاحب کو بھی میرے خلاف غلط گائیڈ کیا ہو گا۔ آپ پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اس قومی امانت یعنی طلسم نور ہیرے کے حصول کے سلسلے میں جلد از جلد کچھ کیجیے۔''

''نوجوان.....''

اچانک میجر وسیم اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا..... اس کی دیکھا دیکھی کیپٹن آصف نے بھی اپنی کرسی چھوڑ دی تھی۔

''تم اتنی بڑی باتیں جھوٹ نہیں کہہ سکتے..... لیکن اگر یہ سب واقعی سچ ہوا تو میں تمہیں سلیوٹ کروں گا..... میں پہلے اپنے ذرائع سے یہ سب معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں..... تمہاری تصاویر بھی حاصل کرنے کی کوشش کروں گا اور تم نے اپنا ملتان کا جو پتا بتایا ہے جہاں تمہارے ماں باپ رہائش پذیر ہیں، یقیناً ملک کے اس بہادر سپاہی کا ایڈریس بھی وہی ہوگا جسے کچھ عرصہ پہلے قومی دن پر فوجی اعزاز سے نوازا گیا تھا۔''

''جناب! میں تو خود یہ چاہتا ہوں کہ آپ خود بھی مجھ سے اپنے طور پر مطمئن ہو جائیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن..... سر! جو بھی کریں جلد کریں.....''

''ڈونٹ وری..... ینگ مین!'' میجر وسیم بارعب لہجے میں بولے۔ ''ساری باتوں کا تو پتا لگانا ممکن نہ ہوگا، لیکن ان میں سے صرف چند بنیادی باتوں کی سچائی جان لینا بھی تمہاری صداقت کے لیے اتنا ہی ثبوت کافی ہوگا میرے لیے.....''

پھر وہ کیپٹن آصف سے مخاطب ہو کر بولے۔

''کیپٹن!''

''سر۔''

''ان تینوں کو وار روم میں لے جا کر بٹھادو..... اور ان کے ہاتھوں کی بندشیں کھول دینا۔''

''او کے سر..... ! بٹ.....''

''یس.....؟''

''سر! وہ ڈی ایس پی بہت شور کرے گا.....''

''ہم.....'' کیپٹن آصف کی بات پر وسیم نے پُرسوچ انداز میں اپنے دونوں ہونٹ بھینچ لیے، پھر چند لمحہ بعد اپنے سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''میں خود اسے کسی طرح قائل کرنے کی کوشش کرتا ہوں..... تم پہلے ان تینوں کو وار روم پہنچادو.....''

''رائٹ سر.....!'' کیپٹن آصف نے مؤدبانہ انداز میں کہا اور پھر میجر وسیم کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا..... کیپٹن آصف ہماری طرف متوجہ ہوا اور پھر وہاں موجود دو رینجرز اہلکاروں سے تحکمانہ کہا۔

''ان تینوں کے ہاتھ کھول دو..... اور میرے ساتھ وار روم پہنچو.....''

اس کے اگلے دس منٹ میں ہم ایک اور کمرے میں آگئے جو نسبتاً بہتر کنڈیشن میں تھا۔ کشادہ بھی تھا اور یہاں فرنیچر بھی رکھا ہوا تھا۔ ہمیں ایک صوفے پر بٹھادیا گیا۔ دو رینجرز کے اہلکار وہاں موجود رہے۔ ہمیں کچھ کھانے کو بھی دیا گیا۔ ایک طرف کونے میں خاصی بڑی میز اور اس کے دو طرف تین چار کرسیاں رکھی تھیں۔ میز پر کمپیوٹر اور ٹیلی فون سیٹس رکھے نظر آرہے تھے۔ اس دوران مجھے اول خیر اور کبیل دادا سے باتیں کرنے کا موقع ملا تو بھی ہم نے ایک دوسرے سے خیر خیریت سے ہی متعلق گفتگو کی، اول خیر اور کبیل دادا نے سب سے پہلے شکیلہ کے بارے میں ہی استفسار کیا تھا۔ طلسم نور ہیرے سے متعلق بھی بات ہوئی اور باقی تفصیل وہ سن چکے تھے۔

ایک گھنٹے بعد کوئی ناٹک ٹائپ آدمی اندر داخل ہوا اور بڑے احترام سے مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''تشریف لائیں سر.....!''

میں اٹھ کھڑا ہوا..... ''یہ بھی میرے ساتھ ہوں گے؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر

پوچھا۔ میرا اشارہ گبیل دادا اور اول خیر کی طرف تھا۔

''شیور سر.....!'' اس نے ادب سے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی تھی۔

ہم تینوں اس کے ساتھ چلتے ہوئے ایک اور کمرے میں داخل ہوئے اور وہاں ہمیں میجر وسیم اور کیپٹن آصف کے علاوہ دو اور افراد نظر آئے۔ یہ نسبتاً ایک آرام دہ کمرا تھا۔ یہاں صوفے بچھے ہوئے تھے اور فرش پر قالین تھا۔ درمیان میں گلاس ٹاپ بڑی سی ٹیبل رکھی ہوئی تھی۔ جس پر کچھ موبائل فون، ٹیلی فون سیٹ اور کارڈلیس نظر آرہے تھے۔ کونے میں ایک شخص بڑی سی دیوار گیر اسکرین کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے سر پہ ہیڈ فون چڑھا رکھا تھا۔ اسکرین ایل ای ڈی، جسے شاید کمپیوٹر سے کنکٹ کیا ہوا تھا، کیونکہ اس میں ایک گراف جس پر سرخ رنگ کی ایرو کی متحرک تھی۔ گراف کے بیچ میں کبھی کسی کی پنسل سے بنائی ہوئی تصویر ابھرتی اور پھر اس کی اسکیننگ ہونے لگتی تو اصل سامنے آجاتا۔

''بیٹھو.....'' میجر وسیم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کا چہرہ کسی گہری سوچ میں مستغرق لگا تھا اور پیشانی پر سلوٹیں ابھری ہوئی نظر آرہی تھیں۔ ہم تینوں اس کے سامنے والے صوفے پر براجمان ہوگئے۔

چاروں افراد کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے یوں لگا تھا کہ میرے سلسلے میں انہوں نے خوب انکوائری کروائی ہوگی اور بات ملتان سے ''بیگم ولا'' تک جا پہنچی تھی۔ جبکہ میری تازہ ترین اطلاعات کے مطابق وہاں ایک نیا ''فتنہ'' نوشابہ کی صورت میں جنم لے چکا تھا۔ اسی فتنے نے پرانے سوئے ہوئے فتنوں کو بھی دوبارہ بیدار کردیا تھا۔ جس میں ایک تو اس کا اپنا باپ چوہدری ممتاز بھی شامل تھا جبکہ اسپیکٹرم کا مقامی چیف وزیر جان پہلے ہی درپردہ رہتے ہوئے اس کی پشت پناہی میں مصروف تھا، یہی نہیں نوشابہ اپنے باپ کی سیاسی پارٹی میں بھی پوری طرح سے ''اِن'' اور ''ایکٹو'' ہوچکی تھی، اس پر طرہ..... ان کی پارٹی کے اگلے چند ماہ میں ہونے والے عام انتخابات میں جیت کی بھرپور امید بھی کی جارہی تھی۔ عوامی حمایت اسے بھرپور حاصل تھی۔

''سنو، مسٹر شہزاد.....!'' میجر وسیم نے ہولے سے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے گویا ابتدا کی۔ ''میں نے تمہارے بارے میں بعض اہم [illegible] باتوں کا پتا چلایا ہے۔ اس میں کو[illegible]

بارے میں جو کچھ ہمیں بتایا ہے وہ درست ہے، لیکن اب بھی تمہاری ذات میں ابہام موجود ہے، یوں سمجھو بس، تھوڑی سی کسر... رہ گئی ہے۔'' وہ ذرا رکے اور پھر آگے کہنا شروع کیا۔

''تمہارے سلسلے میں جہاں کچھ مثبت باتوں کا علم ہوا ہے وہیں اس سے کہیں زیادہ منفی حقائق بھی سامنے آئے ہیں.....''

''منفی حقائق.....؟ اور وہ بھی میرے متعلق.....؟'' میں نے الجھن آمیز پریشانی تلے میجر وسیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میجر صاحب! کیا میں نے اپنے بارے میں کچھ غلط بیانی سے کام لیا ہے؟ آپ یہ سمجھ رہے ہیں؟''

''بیگم ولا سے تمہارا کیا تعلق بنتا ہے.....؟'' اچانک انہوں نے میرے چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے سوال کیا۔

''میں تو آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ بیگم ولا..... میری بیوہ بھابی زہرہ بانو کی ملکیت ہے اور میرے ماں باپ وہیں رہتے ہیں.....''

''بیگم ولا کوئی رہائش گاہ ٹائپ جگہ ہے یا کسی خفیہ ہیڈ کوارٹر کی عمارت.....؟'' میجر وسیم نے میری طرف بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہیڈ کوارٹر.....؟ کک..... کیا مطلب.....؟ میں سمجھا نہیں میجر صاحب؟ کس چیز کا ہیڈ کوارٹر.....؟'' میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

''ملک دشمن عناصر کے مذموم مقاصد کے لیے یہ جگہ استعمال میں لائی جارہی ہے۔''

میجر وسیم نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جیسے انکشاف کیا۔ اگرچہ مجھے بھی زہرہ بانو سے ٹیلی فونک گفتگو پر اس جھوٹے اور کریہہ الزام کا علم ہوچکا تھا۔ لیکن مجھے حیرت تو اس بات کی تھی کہ اس الزام کو کیا سچ سمجھا جانے لگا تھا۔ کیوں؟ اور کس بنیاد پر؟ یہی سوال جب میں نے میجر وسیم سے پوچھا تو وہ بولے۔

''ہم اپنے طور پر تصدیق کیے بغیر کسی الزام کو سچ نہیں مانتے۔''

''تو آپ نے بیگم ولا کے سلسلے میں کیا تصدیق کی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی تو نہیں..... لیکن ملتان رینجرز کے مطابق کچھ [illegible] لائے گئے ہیں جن کے مطابق اس الزام [illegible] ہے کی گنجائش نہیں رہتی۔''

''میجر صاحب! اب برائے کرم یہ بھی بتا دیں کہ وہ الزام ملتان رینجرز کے علم میں لانے والے کون ہیں؟ ہمارے مخالفین.....؟''

''ہاں.....'' میجر وسیم نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

''تو آپ کے خیال میں ہمارے مخالفین کیا ہمارے بارے میں کوئی اچھی رائے بھی رکھتے ہوں گے؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں طنز کی کاٹ ابھر آئی تھی۔

''ایسا تو نہیں لیکن..... شواہد سے تو یہی لگتا ہے۔''

''جناب! ان شواہد کے بارے میں اور ان کے موجد کا نام بتا سکتے ہیں؟ تاکہ میں ردِ الزام کے بارے میں کچھ کہہ سکوں؟''

''شواہد کے سلسلے میں ملتان رینجرز کے اینٹی ٹیریرسٹ ونگ کو ایک گمنام کال موصول ہوئی تھی کہ بیگم ولا میں اسی وقت ریڈ کیا جائے تو وہاں کافی تعداد میں غیر قانونی اسلحہ اور کچھ مشتبہ افراد کا پورا مسلح گروہ مل سکتا ہے۔'' میجر وسیم نے جواب دیا۔

''مجھے معلوم ہے بیگم ولا پر ریڈ کیا گیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''تو پھر کیا ملا وہاں سے رینجرز کو.....؟''

''اسلحہ ملا تھا اور لوگ بھی..... ایک رہائشی جگہ پر جہاں ایک خاندان اور بچے ہونے چاہیے تھے وہاں..... ان کے بجائے اسلحہ پوش افراد ملے تھے۔ ان میں کئی لوگوں کے پاس غیر قانونی اسلحہ تھا۔''

''کیا ملتان رینجرز کو بیگم ولا میں..... وطنِ عزیز کا وہ جانباز سپاہی نہیں ملا تھا جس نے ملک کی خاطر اپنی جوان حاملہ بیوی اور اپنے ایک چند سال کے بچے کو تقدیر کے حوالے کر دیا اور خود گمنام سپاہی کی حیثیت سے ایک ایسے ملک دشمن جاسوس کے تعاقب میں جا نکلا تھا جو ملک کا ایک اہم راز لے اُڑا تھا..... اور جس نے دشمن ملک میں گھس کر اس جاسوس کو نہ صرف جہنم واصل کیا بلکہ اس کے قبضے سے وہ اہم راز بھی چھین کر ضائع کر دیا تھا۔ وہ راز اگر دشمن ملک کے ہاتھ لگ جاتا تو بنگلہ دیش کی طرح وطنِ عزیز کا ایک اور ٹکڑا ابھی ''سہ لخت کی صورت الگ ہو جاتا۔ اس پاداش میں تاج دین شاہ جیسے دلیر محب وطن سپاہی کو دشمن ملک میں طویل اور پُرمصائب قید جھیلنی پڑی تھی۔'' یہ کہتے ہوئے میرے وجود کا رُواں رُواں فرطِ جوش سے کانپنے لگا تھا۔ کمرے میں اے سی ہونے کے باوجود میری پیشانی پر پسینے کے ننھے منے قطرے نمودار ہونے لگے تھے۔

''وہ سب ٹھیک ہے..... لیکن وہ لوگ اور غیر قانونی اسلحہ.....؟'' میجر وسیم نے استفسار طلب لہجے میں کہا۔

''اسلحہ لائسنس یافتہ تھا، یہ الگ بات تھی کہ کچھ آؤٹ آف ڈیٹ تھا..... اس سلسلے میں کچھ سستی ہو گئی ہو گی۔'' میں نے زہرہ بانو سے کی ہوئی اس ضمن میں گفتگو کے تناظر میں کہا۔ ''رہی بات لوگوں کی تو وہ سب زہرہ بانو کے جاں نثار ساتھی ہیں..... ان سب کا بائیو ڈیٹا بیگم ولا میں موجود ہے۔ ان میں کوئی بھی ہسٹری شیٹر اور بری شہرت والا آدمی نہیں مل سکتا..... ایک بات بتائیں..... ملک کے سربرآوردہ لوگ اپنی سیکیورٹی کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے۔ وہ تو جہاں رہتے ہیں وہاں کے دوسرے عام لوگوں کے راستے تک راڈ لگا کر بلاک کر دیتے ہیں۔ کتے، شیر اور اسلحہ بدست آدمیوں کی پوری فوج ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ اگر بیگم ولا میں چند اسلحہ پوش افراد نظر آ گئے تو کون سا ایسا نیا ہو گیا تھا جس کے باعث بیگم ولا میں ریڈ لگا کر ایک ملکی فوجی اعزاز یافتہ اور وطن کے گمنام سپاہی اور کنٹری ہیرو کے ساتھ یوں بے عزتی کی گئی۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ ایسا آدمی ایسی جگہ پر رہنا پسند کرے گا جو ملک دشمن عناصر کی کمین گاہ کہلاتا ہو؟ اب میری ایک آخری بات کا بھی جواب دے ڈالیں میجر صاحب.....! آپ نے میرے بارے میں ملتان رینجرز سے حقائق تو معلوم کر لیے کیا آپ نے ان سے پوچھا کہ..... چوہدری ممتاز خان، جسے میجر ریاض باجوہ اور کیپٹن عمران وغیرہ کے ساتھ ایک بڑے ریڈ، جس میں خود میں بھی ایک سابقہ پاور ایجنٹ کے طور پر شامل تھا، ملک دشمن عناصر کے ساتھ ساز باز کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا گیا تھا، وہ اب آزاد کیوں ہے.....؟''

میری اس آخری بات نے میجر وسیم کو لاجواب سا کر دیا۔ وہ ایک دم خاموش سے ہو گئے تھے، میں اب نمایاں طور پر یہ بات محسوس کر سکتا تھا کہ وہ میرے سلسلے میں خاصے مخمصے کا شکار ہو گئے تھے۔

میں نے اس بار نہایت پُرزور اور ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ ''میجر صاحب! خدا کے لیے..... مجھ پر اگر اب بھی آپ کو شبہ ہے تو ٹھیک ہے، لیکن اس قومی امانت کے سلسلے میں جلدی کچھ کیجیے..... جو میں اور میرے جاں نثار ساتھیوں نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر حاصل کی تھی، آپ نہیں جانتے وہ صرف ایک ہیرا ہی نہیں ہے بلکہ ایک ایسا ایٹم بم بھی ہے جو اگر دوبارہ مخصوص گروہ کے ہاتھ لگ گیا تو دنیا کو

تیسری عالمی جنگ سے کوئی نہیں بچا پائے گا۔ اس کی تفصیل میں آپ کو بتا چکا ہوں۔''

''یہی ثبوت اگر ہمارے ہاتھ لگ جاتا ہے جس کی نشاندہی تم کر رہے ہو تو..... تم اور تمہارے ساتھی ہر الزام سے یکسر بری الذمہ ہو جائیں گے..... میں تم سے یہی بات آخر میں کہنے والا تھا۔'' میجر وسیم نے کہا اور پھر اسی وقت جیسے وہ متحرک ہو گیا۔ اس نے کیپٹن آصف سے تحکمانہ کہا۔

''اسی وقت ایک دستہ ٹاپ آف کرو..... ہمیں زمیندار شاہنواز خان کی حویلی میں ریڈ کرنا ہے۔''

''سر! میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ جانا چاہتا ہوں.....'' میں نے فوراً کہا۔

''تم کیا کرو گے؟'' میجر وسیم میری طرف متوجہ ہوا.....

''جناب! وہاں میری ایک ساتھی شکیلہ ہی اس کی قید میں نہیں ہے بلکہ شاہنواز خان کی بیٹی سونہڑیں بھی ہے، جسے اپنے باپ کی طرف سے اپنی جان کا خطرہ ہے۔ وہ بھی آپ کو میری باتوں کی گواہی کے لیے کافی ہو گی..... جس سے متعلق تازہ حالات کا ذکر میں آپ سے کر چکا ہوں..... کیونکہ میں ہی انہیں پہچان سکتا ہوں.....''

میجر وسیم میری بات سن کر کچھ دیر ہونٹ بھینچے سوچتے بن گئے اس کے بعد انہوں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

پانچ گاڑیاں تیار کر لی گئیں اور اس مشن میں کیپٹن آصف ہی نہیں بلکہ خود اس فورس کے سربراہ میجر وسیم... بھی شامل تھے۔ گاڑیاں آندھی طوفان کے ساتھ شاہنواز خان کے گوٹھ کی جانب روانہ ہو گئیں.....

☆☆☆

رات اپنے آخری پہر کے سفر میں تھی۔ رینجرز کی چاروں بھاری بھرکم گاڑیاں لاڑکانہ کے مضافات کی طرف دوڑی جا رہی تھیں۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے شاہنواز خان کا گوٹھ لاڑکانہ شہر سے تقریباً ملحقہ تھا۔ صرف چند کلو میٹر کا فاصلہ تھا۔ میں میجر وسیم والی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر براجمان تھا اور میرے پاس کسی قسم کا کوئی اسلحہ نہ تھا، جبکہ کیپٹن آصف دوسری گاڑی میں تھا۔ باقی دو گاڑیوں میں سے ایک ہمارے آگے تھی اور دوسری سب سے پیچھے۔

لگ بھگ کوئی پندرہ بیس منٹ بعد ہم شاہ گوٹھ میں داخل ہو چکے تھے۔ وہاں اب پولیس کا کوئی پہرا نہ تھا۔ البتہ چند مسلح افراد موجود تھے۔ ان میں دو افراد رینجرز کی گاڑیوں کو دیکھ کر فوراً حویلی کے اندر جا گھسے تھے۔ تب تک گاڑیاں حویلی کے احاطے میں داخل ہو چکی تھیں۔ یہ ریڈ شاید اُن کے لیے غیر متوقع نہ ہو۔ تاہم مسلح حواریوں کے چہروں پہ تشویش اور فکرمندی پائی جاتی تھی۔

ہم سب گاڑیوں سے نیچے اتر آئے تھے۔ احاطے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر فولادی پائپوں پر گلوب نصب تھے، جن میں چند ایک ہی بجھے ہوئے تھے، باقی روشن تھے۔ اسی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ حویلی کے بڑے سے مرکزی دروازے پر تین افراد نمودار ہوئے۔ دو تو وہی مسلح آدمی لگتے تھے جنہوں نے ہماری گاڑیوں کو حویلی کے وسیع احاطے میں داخل ہوتے دیکھ کر فوراً اندر کی راہ لی تھی جبکہ تیسرا کوئی دبنگ سا شخص نظر آتا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس سے متجاوز ہی دکھائی دیتی تھی۔ چہرہ بھاری اور گول تھا، رنگ گندمی، سر کے بال پیشانی سے نصف سے زائد اُڑ چکے تھے۔ آنکھیں چھوٹی اور گول تھیں۔ چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں۔ قد کاٹھ کچھ دراز قامت تھا۔ میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا، ازیں علاوہ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس نے میری طرف بہت غور سے ایک نظر دیکھا تھا۔

''جی میجر صاحب! خیریت تو ہے..... یہ سب کیا ہے.....؟''

اس نے میجر وسیم کا جائزہ لینے کے بعد فوراً گمبھیر سے لہجے میں پوچھا۔ وہ مجھے خاصا زیرک دماغ اور چلتا پرزہ ٹائپ چالاک آدمی لگا تھا۔ پڑھا لکھا بھی لگتا تھا۔ اس نے میجر کی وردی اور نام پہلی فرصت میں دیکھ لیا تھا۔

''حویلی کی تلاشی لینا ہے ہم نے اور شاہنواز خان سے بات کرنی ہے۔'' میجر وسیم نے کھنڈی ہوئی متانت کے ساتھ اس سے کہا۔

''کیسی تلاشی؟ کیا جرم ہوا ہے یہاں.....؟'' مذکورہ شخص نے فوراً پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟ اور اپنی حیثیت واضح کرو.....'' میجر وسیم نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے رعب دار لہجے میں اس سے کہا۔

''میرا نام صالح جان ہے.....'' مذکورہ شخص نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''اور..... میں شاہنواز خان کا ایک قریبی رشتے دار ہوں، ان کی غیر موجودگی میں حویلی وغیرہ کی دیکھ بھال میرے ہی ذمے ہوتی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن..... میجر صاحب! آپ کے پاس کوئی تلاشی کا وارنٹ، کوئی اجازت نامہ تو ہو گا.....؟''

''ہمیں جو خصوصی اختیارات تفویض کیے گئے ہیں، ہم اسی کے تحت حویلی کی تلاشی لینے آئے ہیں۔ اب آپ مہربانی کر کے راستہ چھوڑ دیں.....'' کہتے ہوئے میجر وسیم نے اس کے جواب کا بھی انتظار نہ کیا اور ہمیں اشارہ کرتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔ صالح جان نامی وہ شخص خاصا برہم نظر آرہا تھا، میں نے اسے اپنا موبائل نکالتے ہوئے دیکھا۔

بہرکیف ہم سب اندر داخل ہو چکے تھے۔ رینجرز کے اہلکاروں نے کیپٹن آصف کی سرکردگی میں اوطاق سمیت پوری حویلی کی تلاشی شروع کر دی تھی۔ مگر حیرت انگیز طور پر حویلی میں سوائے ملازمین کے اور کوئی نہ ملا تھا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ زمیندار شاہنواز خان اپنی فیملی کے ساتھ اپنے کسی رشتے دار کی شادی میں شرکت کے لیے فیملی سمیت جامشورو گیا ہوا تھا۔

بہرطور شکیلہ، ارم اور اس کے دونوں بچوں کو بھی تلاش کیا گیا اور جب ان کے بارے میں پوچھا گیا تو سب نے اس سلسلے میں قطعاً لاعلمی کا اظہار کیا۔ یہی نہیں جب شاہنواز خان کے دو مقربِ خاص کارپردازوں کوڑا خاں اور بخشل کے بارے میں پوچھا گیا تو ان دونوں کو حواریوں نے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا۔ کیونکہ اگر یہ دونوں بھی مل جاتے، میجر وسیم انہیں گرفتار کر کے تفتیش وغیرہ کے سلسلے میں ساتھ لے جانے کا پکا ارادہ کر چکے تھے۔ جبکہ وہاں کوئی بھی بخشل اور کوڑا خان کو جیسے جانتا ہی نہ تھا.....! میرے دل و دماغ کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ''کالی بھڑیں'' پہلے ہی حرکت میں آچکی تھیں اور جنہوں نے شاہنواز خان کو ایسے کسی خطرے سے پیشگی آگاہ کر ڈالا تھا۔ شاہنواز ایک شاطر اور عیار دماغ آدمی تھا۔ اثر و رسوخ اپنی جگہ لیکن جہاں دیکھتا ''بھاگنے اور چھپنے'' میں عافیت ہے تو وہ یہ کام بھی چالاکی سے کر ڈالتا تھا اور یہی اس نے کیا تھا۔

اس مردود انسان نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنے غیاب کے ساتھ ساتھ شکیلہ اور ارم وغیرہ کو بھی غائب کر کے کسی اور خفیہ جگہ منتقل کر دیا ہوگا..... ازیں علاوہ طلسمِ نور ہیرے کے بارے میں بھی میں ابھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ..... شاہنواز کے ہاتھ لگا تھا یا نہیں..... جبکہ شکیلہ کو..... اس نے ہیرے کی تلاش میں اپنے مسلح حواریوں (کوڑا خان وغیرہ) کے ساتھ روانہ کیا تھا اور خود بھی ان کے ساتھ تھا، پھر کیا ہوا تھا؟ ہیرا اُن کے ہاتھ لگا تھا یا نہیں، شکیلہ کا انہوں نے خدانخواستہ کیا انجام کیا تھا.....؟ اس کے بعد کا مجھے کچھ علم نہ تھا کہ کیا ہوا تھا.....؟ کیونکہ پھر پرو چانڈیو نے حویلی میں حملہ کر دیا تھا..... یہی وجہ تھی کہ مجھے شکیلہ کی طرف سے زیادہ فکر و تشویش لاحق تھی، کیونکہ شاہنواز جیسے سفاک اور درندہ صفت آدمی سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔

بہرطور..... میری رینجرز کے ہاتھوں حوالگی اس کے علم میں لائی جا چکی ہوگی، وہ جانتا تھا کہ میں رینجرز کو کیا کچھ بتا سکتا ہوں۔ اس نے سب سے پہلے اپنے ان دونوں خاص حواریوں، بخشل اور کوڑا خان کو فوراً غائب ہو جانے کا حکم دیا ہوگا اور خود شادی کے بہانے اپنی بیٹی سونہڑیں کو لیے جامشورو نکل گیا، اگرچہ مجھے اس پر بھی شبہ تھا کہ وہ جامشورو گیا بھی ہوگا یا محض ایسا ظاہر کیا گیا تھا۔

ملازمین میں بھی مجھے بیشتر نئے لوگ نظر آرہے تھے، چند ایک پرانے غائب تھے۔ ان کے ''غیاب'' میں بھی یہی مقصد کارفرما ہوگا کہ ایسی کسی متوقع صورت میں یہاں حویلی میں اس کی خود ساختہ غیر موجودگی کے دوران کوئی زیرِ تفتیش نہ لایا جا سکے..... ازیں علاوہ وہاں کے ملازمین سے میرے بارے میں بھی میجر وسیم نے دریافت کیا تھا، مگر وہ سب کے سب مجھے پہچاننے سے انکاری ہو گئے تھے۔ اس دوران صالح جان نے اپنا موبائل میجر وسیم کی طرف بڑھاتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

''یہ ایم این اے شاہ صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں.....''

''سوری! اس وقت میں کسی سے بات نہیں کر سکتا۔'' میجر وسیم نے سنجیدگی کے ساتھ فون سننے سے انکار کر دیا اور وہ اندر ہی اندر بری طرح تلملا کر رہ گیا۔

لیکن اِدھر میں زمیندار شاہنواز خان کی زیرک دماغی اور مکاری پر..... بے بسی کے ساتھ اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

رینجرز کے لیے اب وہاں کرنے کو کچھ نہ تھا۔ تھوڑی سی پوچھ گچھ کے بعد میجر وسیم..... نے جوانوں کو واپسی کا حکم دیا تو میں نے کہا۔

''میجر صاحب! شاہنواز نے زبردست چال چلی ہے، مجھے اس بات کا خدشہ پہلے سے تھا..... وہ ایک اثر و رسوخ والا آدمی.....''

''میرا خیال ہے اس مسئلے کو ہیڈ کوارٹر چل کر آرام سے ڈسکس کر لیں گے۔'' انہوں نے میری بات کاٹ دی اور جوانوں کو واپسی کا حکم دیا۔ میں نے غور کیا وہ میری طرف سے ایک بار پھر کسی شک و شبہے کا شکار ہونے لگے

تھے۔ مجھے یہ میجر لکیر کا فقیر معلوم ہوا۔ اس کے اندر اپنے تئیں کچھ بوجھنے اور صورتِ حال کی بھل بھلیوں کو سمجھ کر اس سے کچھ اخذ کرنے کی صلاحیت کم ہی تھی یا پھر وہ اسے استعمال کرنے سے اعراض برت رہا تھا، تاہم انہیں بھی کچھ قانونی تقاضوں کا پاس رکھنا ہی پڑتا ہے۔ خاموش میں بھی نہیں ہوا۔ بولا۔

''جناب! صرف چند منٹ مجھے دیں..... میں ذرا اپنے طور پر بھی کوئی کلیو تلاشنے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں.....''

میری بات سن کر میجر وسیم نے اپنی رسٹ واچ پر ایک نگاہ ڈالی اور سپاٹ لہجے میں مجھ سے بولا۔

''صرف دس منٹ.....''

''شکریہ جناب!'' میں نے غیر تاثر انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کمرے کی جانب دوبارہ رخ کیا جہاں میری، شاہنواز کے ساتھ گفتگو ہوئی تھی۔ وہاں میرے ساتھ ارم بھی تھی۔ میں اس کمرے میں پہنچا اور غور سے ایک ایک چیز کا جائزہ لینے لگا۔ میرے ساتھ میجر وسیم نے جوانوں کو کر رکھا تھا۔

ادھر صالح جان مجھے تیز سی کڑوی اور برماتی نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ میں نے دو ایک کمروں کا خود بھی دوبارہ اچھی طرح جائزہ لیا اس کے بعد مایوس سا ہو کر میجر وسیم کے پاس آیا تو صالح جان، میجر وسیم سے احتجاجاً بولا۔

''میجر صاحب! یہ آدمی تو کوئی سویلین لگتا ہے مجھے، اسے کیا اختیار ہے کہ وہ ایک معزز آدمی کے گھر کی یوں تلاشی لے..... میں اس پر اپنا احتجاج ریکارڈ کروانے کا حق رکھتا ہوں۔''

صالح جان نچلا بیٹھنے والا آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ یوں بھی اس نے شروع سے آخر تک..... ہمارے ساتھ ساتھ رہنے کی کوشش کی تھی۔ ظاہر تو ہو چکا تھا کہ شاہنواز خان نے اپنی غیر موجودگی میں خصوصی طور پر حویلی بلایا تھا۔ اگرچہ میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یعنی شاہنواز خان سے ٹاکرا ہوتے وقت یہ تھا۔ وہ شاہنواز کے لیے بار بار ''وڈو بھا'' (بڑا بھائی) کے الفاظ استعمال کر رہا تھا جو یقینی طور پر کوئی قریبی شخص ہی کہہ سکتا تھا۔

میجر وسیم نے اس کی طرف گمبھیر نظروں سے دیکھا اور میری جانب خفیف سا اشارہ کرتے ہوئے اس سے جواباً بولے۔

''یہ آدمی بہ طور چشم دید گواہ کے یہاں لایا گیا ہے، اس کا کہنا ہے کہ اسے یہاں قید میں رکھا گیا تھا اور اس کی دو ساتھی لڑکیاں بھی یہاں ابھی تک قید ہیں، ان سب باتوں کی تفصیل تو لمبی ہے، لیکن ابھی اتنا کافی ہے۔''

''بہت خوب میجر صاحب!'' صالح جان طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اگر کوئی ایرا غیرا آپ کے پاس یہ کہنے آجائے کہ اس حویلی میں مجرا ہوتا ہے تو کیا آپ اس کی بات کا یقین کر لیں گے؟''

''سنو مسٹر.....! کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا.....؟'' میجر وسیم نے اس کی طرف اپنی انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے بارعب اور ذرا سخت لہجے میں کہا۔

''صالح جان۔''

''ہاں، صالح جان! اپنا لہجہ دھیما اور تمیز کو ملحوظ رکھو..... ہم کسی مصدقہ اطلاع پر ہی ایسی کارروائی عمل میں لاتے ہیں۔ ہم دوبارہ بھی آسکتے ہیں.....''

یہ کہہ کر میجر پلٹا۔ میرے اندر زبردست دھکڑ پکڑ طاری تھی۔ شاہنواز ہمیں چکما دے گیا تھا اور آئندہ بھی یہی روش قائم رکھنے والا تھا۔ میجر وسیم مجھ سے اب کچھ خاص مطمئن نظر نہیں آرہے تھے جبکہ شاہنواز کے سلسلے میں اب کیا کرنا چاہیے تھا اس کا تعین اب خود مجھے ہی کرنا تھا۔ میں اس کے بارے میں اندر ہی اندر بہت غور و خوض کر رہا تھا اور اسی سبب کئی جارحانہ خیالات میرے اندر تیزی سے سر اٹھانے لگے تھے۔

پولیس ہو یا رینجرز یہ اپنی قانونی حدود و قیود کے محتاج تھے، جبکہ شاہنواز جیسے خطرناک اور چالاک مجرم ہوں تو بسا اوقات یہی قیود ان کے لیے راہِ مفر کہلاتی ہے۔ پل کے پل میں نے ایک حتمی فیصلہ کر ڈالا جو ایسے نازک موقع پر مجھے بارہا کرنا پڑتا تھا۔

میرا یہ فیصلہ جارحانہ ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی تھا مگر سچائی اور حقائق کو سامنے لانے کا اس کے سوائے مجھے کوئی اور طریقہ نہیں سوجھا تھا۔ حالانکہ اس میں رسک تھا، میری جان بھی جا سکتی تھی، جبکہ اول خیر اور کیپٹن دادا پہلے ہی ایک طرح سے رینجرز کی تحویل میں ہی تھے۔ میری نظر میں وہ محفوظ تو تھے کہ کم از کم کسی دشمن اور بالخصوص انسپکٹر رجب دین جیسے راتب خور کی گرفت سے آزاد تو تھے۔

دوبارہ گاڑیوں میں سوار ہوتے وقت میرے اندر ایک طوفان سا مچلنے لگا اور دانستہ میں نے دوسری گاڑی میں سوار ہونا پسند کیا تھا۔ اس میں ڈرائیور سمیت صرف چار رینجرز کے اہلکار سوار تھے۔ ایک اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر میں، جبکہ دو درمیانی نشست پہ۔ مراجمان تھے، میں

نے اپنے لیے سب سے آخری والی سیٹ کا انتخاب کیا تھا اور گاڑی میں سوار ہوتے ہی میں نے سب سے پہلے اس کے عقبی دروازے کا جائزہ لیا تھا۔

مجھے جو کرنا تھا، اس کے لیے میں وقت اور جگہ کا تعین کرنے لگا۔ گاڑیاں کچے میں دوڑ رہی تھیں اور میرا سوچتا ذہن اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ فراٹے بھر رہا تھا۔

گاڑیاں ہچکولے کھا رہی تھیں۔ میں اگلے چند لمحات میں جو خطرناک قدم اٹھانے والا تھا، مجھے احساس تھا کہ میں رینجرز کی تحویل میں ہوں اور یہ کوئی عام لوگ نہیں تھے۔ اینٹی ڈکیت فورس کے یہ اہلکار خصوصی تربیت کے حامل تھے۔ اگرچہ میں نے بھی انہی کے انداز میں تربیت حاصل کر رکھی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ میری تربیت کی خصوصیت ان سے کچھ سوا ہی تھی۔ تاہم میں نے اچھی طرح سوچ لیا تھا کہ مجھے کس وقت اور کون سا قدم اٹھانا ہے۔

آخر رات کی گھپ تاریکیوں میں گاڑیاں..... کچے پکے اور اپلے تھپی دیواروں والے گھروں کی بے ترتیب قطاروں کے پاس سے گزرتی ہوئی کھیتوں کے درمیانی بل کھاتے کچے راستے پر ہولیں تو میں غیر محسوس انداز میں دھیرے دھیرے عقبی دروازے کی طرف سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی کھسکنے لگا۔ قسمت بھی شاید میرا ساتھ دے رہی تھی کیونکہ جس گاڑی کے اندر میں سوار تھا، وہ سب سے آخر میں ہو گئی تھی۔ آگے ان کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں جبکہ ہماری گاڑی کے عقب میں اندھیرا تھا۔ ماسوائے سرخ ٹیل لائٹ کے۔

کھیتوں کے درمیان بل کھاتے دھول اُڑاتے کچے راستے پر قوس کی صورت میں گاڑیاں گھومتی ہوئیں جب ایک نہر کی پلیا پر چڑھنے لگیں تو مجھے اس کی دوسری طرف کیکر کا گھنا جنگل سا نظر آیا، اور ایک طرف قبرستان تھا۔ پُلیا قدرے اونچائی پر تھی اس لیے وہ سب لوگ سامنے ہی نظریں جمائے ہوئے تھے، میری طرف سے ان کی غافل نظروں کا مطلب یہی تھا کہ میں کوئی قیدی نہیں تھا۔

ٹھیک اسی وقت جب ہماری گاڑی پُلیا پر چڑھی میں سیٹ سے فرش پر آچکا تھا اور دروازے کو اوپر اٹھاتے ہی میں نے گاڑی کے فرش پر لیٹے لیٹے ہی خود کو لڑھکنی دے کر باہر گرا دیا۔ گاڑی کے ہچکولوں میں ممکن تھا انہیں احساس نہ ہوا۔ اسی قلیل موقع سے فائدے اٹھاتے ہی میں نیچے گرا۔ بھربھری مٹی والی زمین پر گرتے ہی میں لڑھکتا ہوا نہر کے کراڑے پر آ گیا۔ پُلیا پر چڑھتی گاڑی کی رفتار یوں بھی کم ہو گئی تھی۔ گاڑیاں آگے نکل گئیں۔ مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہ تھی کہ انہیں زیادہ دیر تک میرے اس ''غیاب'' کا پتا نہیں چلے گا۔ لیکن میں اس تھوڑے سے ہی وقت میں جتنا مجھے ملتا، اپنا کام نمٹا لینا چاہتا تھا کہ ان کی گرفت میں نہ آسکوں.....

کراڑے پر گرتے ہی میں اٹھا اور سر ابھار کر دیکھا۔ رینجرز کی گاڑیوں کی ٹیل لائٹیں دور ہوتی نظر آ رہی تھیں اور جس وقت میں..... پُلیا پر چڑھتے ہوئے دوسری جانب بنے کیکر کے گھنے جنگل میں داخل ہونے لگا تو میں نے محسوس کیا کہ رینجرز کی گاڑیاں رک چکی تھیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ انہیں میرے غیاب کا علم ہو چکا ہے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور یکلخت اعصاب تن گئے۔

میں نے جنگل میں دوڑ لگا دی۔ اسی وقت میں نے رینجرز کی گاڑیوں کو ریورس ہو کر پلٹتے دیکھا۔ کیونکہ اب ہیڈ لائٹس کی روشنیاں اسی طرف پڑنے لگی تھیں، میں تاریکی میں دوڑتا چلا گیا..... راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ میں قبروں پر چل رہا ہوں، مجھے اس کا افسوس تھا۔ ایک پرانی اور دھنسی ہوئی قبر پہ پاؤں پڑا تو میں اندر ہی جا گرا.....

☆☆☆

بے اختیار میرے منہ سے چیخ سی نکل گئی۔ ناگوار بُو کا تیز بھبکا میرے چہرے سے ٹکرایا اور ساتھ ہی وہ ہڈیاں بھی جو یقیناً اس مردے کی تھیں جسے دفن ہوئے نجانے کتنا عرصہ بیت چلا ہو گا۔ اس کی روح عالمِ برزخ یا عرشِ بالا کے نجانے کون سے درجے پہ ہو گی، تاہم ایک کالی بھٹ قبر کے اندر خود میں کسی لاش ہی کی طرح سما گیا تھا۔ زندہ حالات میں قبر کا تصور ہی لرزہ دینے کے لیے کافی ہوتا ہے چہ جائیکہ میں تو بہ قائمیِ ہوش و حواس اندر لیٹا تھا۔ چند ثانیے میں اسی طرح دہشت زدہ سا مبہوت حالت میں پڑا رہا، ہوش آیا تو میں نے فوراً سے پیشتر باہر نکلنے کا ارادہ کیا مگر ابھی میں نے اپنا سر قبر سے باہر نکالا ہی تھا کہ ہیڈ لائٹس کی طوفانی روشنیاں چمک اٹھیں ساتھ ہی گاڑیوں کے شور کی آواز بھی سنائی دی۔ تب ہی ایک خیال کلک ہوا۔ یہ قبر، منکر نکیر سے حساب کتاب کیے بغیر میری نجات کا سبب بن سکتی تھی۔ اخروی نہیں تو دنیوی سہی۔ اس خیال سے میں اندر ہی ہنس پڑا۔ میں نے فوراً ہی دوبارہ اپنا سر یوں قبر کے اندر کر لیا جیسے مجھے نیچے سے کسی نے کھینچ لیا ہو اور دو آنکھیں مجھے گھور کر کہہ رہی ہوں۔

''کیوں میاں! حساب کتاب دیے بغیر کدھر جانے کا ارادہ کیے ہوئے ہو.....؟''

پھٹی ہوئی اس شکستہ حال قبر کی تہ اور لحد میں کوئی فرق نہ رہا تھا، مٹی جھڑ جھڑ کے سب برابر ہو چلا تھا لیکن میں نے پھنس پھنسا کر..... اپنی جگہ لحد کے اندر بنا ہی ڈالی۔

گاڑیوں کے انجن کی گھرر..... گھرر..... کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ میں دم بہ خود سا قبر کے اندر پڑا رہا۔ مٹی کی کچر..... کچر..... اور اس کی سوندھ سے مجھے کوفت ہو رہی تھی۔ قبر کے اندر اس طرح لیٹنے کا میرا یہ پہلا ہی تجربہ تھا اور کم بھیانک نہ تھا۔ دفعتاً کچھ روشنیاں لہرائیں۔ باتوں کی بھی آوازیں ابھریں..... میں دم سادھے لیٹا رہا۔ ایسا نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ ایک ایک قبر کو کھنگالنے کی سوچتے۔ نہ ہی ان کے سان وگمان میں یہ بات ہوسکتی تھی کہ میں یہاں کسی قبر میں بہ حالت زندہ یوں محوِ استراحت ہوسکتا ہوں.....

تھوڑی دیر تک یہی سب کچھ چلتا رہا اس کے بعد دوبارہ گاڑیوں کی گھرر..... گھرر..... کی آواز ابھری اور پھر ایکا ایکی سسکیاں لیتا سناٹا طاری ہوگیا۔ ایسی ہی بھیانک اور خوفناک گھڑیوں میں جب میں لحد اور قبر سے باہر نکلنے کی تیاریوں میں تھا مجھے احساس ہوا جیسے میرے جسم پر لاتعداد حشرات الارض رینگنے لگے ہوں..... میری روح تک کانپ گئی۔ کیا کیڑے مکوڑے مجھے مردہ سمجھ کر اسی ڈھانچے جیسا بنانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے، جس کی قبر پر میں نے ناجائز قبضہ جما رکھا تھا؟ اب تو چبھن بھی محسوس ہونے لگی۔ جب لیٹا تھا کیڑے مکوڑے ٹھہرے ہوئے سے تھے، اب جو ہلا جلا تو ان میں بھی لگتا تھا کہ ہلچل مچ گئی ہو، وہ مجھے کاٹنے لگے تھے۔ میں اچھلا اور قبر سے باہر آکر پاگلوں کی طرح اپنا جسم جھاڑنے لگا۔ تب بھی بات بنتی محسوس نہ ہوئی تو میں نے اپنی شرٹ اتار لی اور پھر پتلون بھی، حشرات الارض کی دہشت ایسی مجھ پہ سوار ہوئی کہ میں نے آخر میں زیرِ جامہ تک اتار دیا۔

اگر کوئی مجھے اس حالت میں ناچتے اچھلتے دیکھ لیتا تو کوئی پاگل دیوانہ یا چلّہ کاٹنے والا ہی سمجھتا۔ لیکن وہ کیا جانتا تھا کہ میں یہ رقصِ خوش فہم کسی بنائے نجات کے لیے ہی جھیل رہا تھا۔ اس اچھل کود میں خاصے کیڑے جھڑ گئے۔ باقیوں کو میں نے نوچ نوچ کر اتار دیا۔ کیکر کے قبرستان والے اندھیرے جنگل میں مجھے خود کو کپڑوں سے برہنہ دیکھ کر سخت شرم محسوس ہونے لگی۔ حالانکہ یہاں میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔

قبرستان والے اس جنگل میں بلا کا سناٹا طاری تھا۔ دور کبھی کسی آوارہ جانور کے بولنے کی آواز ابھرتی اور پھر وہی دھڑکا دینے والی خاموشی طاری ہوجاتی۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے..... رینجرز والے شاید کہیں اور جگہ پر میری تلاش میں جا چکے تھے۔ ممکن تھا وہ پلٹ کر دوبارہ اسی جگہ آتے۔ میں نے ایک اندازے کے مطابق چلنا شروع کردیا اور جنگل سے نکل کر نہر کے پاس آگیا۔ یہ شاید کسی قریبی گزرتے ہوئے دریا سے نکلتی تھی۔ پتا نہیں یہ میرا وہم تھا یا کیا تھا مجھے ابھی تک اپنے جسم پر کیڑے مکوڑے چلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ میں اس ذرا تصور سے ہی لرز گیا تھا جب حقیقت میں موت گلے لگے گی اور مقدر میرا قبر ہوگی تو اس وقت میں کیڑے کیسے جھاڑوں گا.....؟ میں نے دل ہی دل میں سورہ یٰسین شریف اور آیت الکرسی پڑھی، اللہ سبحان تعالیٰ سے اپنے کردہ و ناکردہ گناہوں کی معافی مانگی اور عذابِ قبر سے پناہ مانگتے ہوئے..... نہر میں اتر گیا۔

میں نے ایک بار پھر کپڑے اتار لیے تھے اور نہر کے ٹھنڈے پانی میں نہا کر باہر نکلا، اس کے بعد کپڑے پہنے۔ گردوپیش پر ایک نظر ڈالی اور پُلیا کی طرف قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

پُلیا پار کر کے میں نے واپسی کا راستہ اختیار کرلیا تھا۔ یہاں گاؤں گوٹھوں میں کھیتوں کی حفاظت وغیرہ کے لیے لوگوں نے کتے چھوڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ مجھے ان کا بھی دھڑکا لگا ہوا تھا۔ کیونکہ مجھے دور کہیں کسی کتے کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دی تھیں مگر میں اللہ کا نام لیے واپسی کے سفر پر گامزن رہا۔ میں پہلے سے ہی شاہنواز خان کی حویلی کا راستہ اپنے ذہن میں پکا چکا تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر بھی ہو رہی تھی کہ میجر وسیم اور کیپٹن آصف یوں آسانی سے میری ناکام تلاش کے بعد اتنی جلدی چلے کیوں گئے تھے۔

بہرطور یہ میرے لیے غنیمت تھا۔ وہ اب بھلا مجھے کہاں تلاش کرسکتے تھے؟ انہیں شاید تسلی ہوگی کہ میں کہاں جا سکتا تھا۔ کیونکہ میرے دو ساتھی (اول خیر اور کبیل دادا) ان کی تحویل میں تھے۔ انہیں شاید جلد یا بدیر میری رضاکارانہ واپسی کی امید ہوگی۔

میں مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ مشرق کی سمت اب پو پھٹتی نظر آرہی تھی جو سحرِ صبح کی نشاندہی کرتی تھی۔ میں تاریک اور کچے راستوں میں آگے بڑھتا رہا۔ کتوں کے ڈر سے میں نے کھیتوں کے بیچ گزرنے سے اجتناب ہی کیا تھا۔ نسبتاً کھلے راستے سے ہوتا ہوا میں آبادی میں داخل ہوگیا۔ دیہی ماحول خواہ پنجاب کا ہو یا سندھ کا، ایک ہی ہوتا ہے۔

یعنی الصباح بیداری..... لوگ باگ جاگنے لگے تھے۔ پیچھے سے ایک سائیکل والا دودھ کے کین کھڑکھڑاتا ہوا، روایتی دستور کے مطابق مجھے سلام کرتا ہوا گزرا.....

تقریباً نصف گھنٹا چلتے رہنے کے بعد میں..... شاہنواز خان کی حویلی والے علاقے میں داخل ہو چکا تھا۔ صبح کاذب کی روشنی دھیرے دھیرے پھیلنے لگی تھی۔ میں نئی مہم جوئی کے لیے خود کو ذہنی اور جسمانی طور تازہ دم کرنے کے لیے ذرا دیر کو ستانے کے لیے پیپل کے ایک گھنے درخت تلے رک گیا۔

گاؤں رفتہ رفتہ بیدار ہو رہا تھا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ ٹھہری ٹھہری فضا میں مدھر باں ہونے لگی تھی۔ میں پھر چل دیا۔ جلد ہی مجھے شاہنواز خان کی حویلی کا خاکہ نظر آنے لگا۔ میں تھوڑا اور اس کے قریب جا کر رک گیا اور اس کے اردگرد کے علاقے کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گیا۔ بلند و بالا حویلی کے دو طرفہ تو ہموار سطح تھی، مٹی اور گرد کا میدان سا تھا۔ دائیں جانب..... کماد کے کھیتوں کا سلسلہ دور تک جاتا دکھائی دیا۔ عقب میں..... بھی کھیت ہی نظر آتے تھے۔ صرف سامنے اور بائیں رخ پر مذکورہ میدان تھا۔ مجھے دور ہی سے..... چند ایک مسلح حواریوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں تھوڑا اور آگے بڑھا اور پھر ذرا قریب پہنچ کر میں نے راستہ بدل ڈالا۔

اب میرا رخ بائیں جانب کماد کے کھیتوں کی طرف تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے مجھے اپنے اصل راستے سے ہٹ کر..... ایک خاصا بڑا چکر کاٹنا پڑا تھا تاکہ میں کسی حواری کی نگاہ میں نہ آسکوں..... اگلے چند منٹوں بعد میں کھیت کے اندر کسی چیتے کی طرح گھات لگائے بیٹھ گیا اور چند لمحے بعد میں نے حویلی کی عقبی سمت سرکنا شروع کر دیا۔

جہاں کماد کا کھیت ختم ہوتا تھا..... وہاں سے حویلی کی پچھلی دیوار صرف دس بارہ فٹ کے فاصلے پر تھی۔ میں وہیں سرے پہ دبک گیا اور یونہی گردوپیش کی سن گن لیتا رہا..... ہر طرف خاموشی تھی۔ یہاں کوئی پہرے دار کئی ثانیوں تک نہیں گزرتا دکھائی دیا تو میں..... نے دیوار کا دور سے ہی دبک کر جائزہ لیا۔

میں نے خفیہ طور پر حویلی کے اندر اس وقت تک ڈیرا ڈالنے کا ارادہ کر رکھا تھا جب تک کہ مجھے حقائق کا ادراک نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ در پردہ رہتے ہوئے بھی بہت سے ''پردے'' اٹھ جاتے ہیں۔

حویلی کی عقبی دیوار خاصی ''سی پیچ'' زدہ نظر آرہی تھی۔ وجہ یہی تھی کہ عمارت کا سارا واٹر اینڈ ڈرینج سسٹم کے پائپوں کا جال اس دیوار پر پھیلے ہوئے ہونے کے باعث پانی رستا رہتا تھا۔ مجھے حویلی کے ایسے دریچوں کی تلاش تھی جس سے میں اندر داخل ہونے کی کوئی راہ ڈھونڈتا۔

اوپری منزل پر تین، چار دریچے دکھائی دے رہے تھے۔ نیچے دو دریچے تھے اور دونوں ہی بند تھے۔ باقی چند ایک دریچوں پر روشن دان کا گمان ہوتا تھا۔ اچانک ہی میری نگاہ دیوار کے آخری سرے پر پڑی، یہ میرے سیدھے ہاتھ کی دیوار تھی جو آگے سے گھوم کر حویلی سے ملحقہ اوطاق کی طرف چلی گئی تھی۔ وہاں مجھے کوئی دروازہ سا محسوس ہوا۔ اس کا یقین کرنے کے لیے میں کماد کی آڑ لیے تھوڑا اور اسی سمت کو سرکنے لگا مگر چند فٹ تک سرکنے کے بعد مجھے تھمنا پڑا تھا کیونکہ اس کے بعد کھیت کی حدود ختم ہو رہی تھی۔ مذکورہ سمت کی طرف کچھ مزید قریب آنے پر مجھے وہ دروازہ ہی لگا تھا لیکن اس کی چوکھٹ جس پر مجھے سرخ پختہ اینٹیں نظر آرہی تھیں..... اب مجھے دروازہ دیکھنے کے لیے کھیتوں کی آڑ سے باہر نکلنا پڑتا۔

بہرحال کچھ بھی تھا، مجھے یہ رسک تو لینا ہی پڑتا۔ لہٰذا میں نے اللہ کا نام لیا اور پہلے دائیں بائیں دیکھا، کسی ذی نفس کی غیر موجودگی کی تسلی کرتے ہی میں نے اپنے تیز کی سے دھڑکتے دل پر قابو پایا اور بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ کماد کے کھیتوں سے نکلا اور مذکورہ سمت دوڑا.....

قریب پہنچتے ہی میں دیوار سے چپک گیا اور اگلے ہی لمحے میں نے دوبارہ حرکت میں مطلق دیر نہ لگائی تھی۔ وہ سنگل پٹ کا ایک سالخوردہ دروازہ تھا۔ میرا یہ شبہ بالکل درست ثابت ہوا تھا کہ اصل چوکھٹ سے وہ تقریباً ڈیڑھ فٹ اندر کی طرف دھنسا ہوا تھا۔ دروازے پر باہر کی جانب سے کنڈی تو نہیں لگی ہوئی تھی تاہم جب میں نے اسے اندر کی طرف ہلکا سا دھکا دیا تو وہ تھوڑا ہلتا ہوا محسوس ہوا مگر کھلا نہیں تھا۔ میں نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ اپنے وجود کو چوکھٹ کے خلا میں سمو دیا تاکہ فوری طور پر کسی کی نظروں میں آنے سے محفوظ رہ سکوں..... اگر ممکنہ طور پر دائیں بائیں کی دیوار سے کوئی اچانک نمودار ہو جاتا تو جب تک وہ بالکل قریب نہ آجاتا، مجھ پر اس کی نگاہ نہیں پڑ سکتی تھی۔

تھوڑا اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے دروازے پر ہلکی ہلکی زور آزمائی شروع کر دی۔ سب سے پہلے میں نے اس کی کوئی جھری سی تلاش کر کے جھانک کر

تسلی کر لی تھی کہ کوئی اندر موجود تو نہ تھا، نیز یہ دروازہ کسی اسٹور نما بند کمرے کا تھا یا پھر کوئی عام رہائشی کمرا تھا۔ اگرچہ دروازے کی باہر سے حالت دیکھ کر تو یہی لگا تھا کہ وہ کسی اسٹور کا ہی دروازہ ہوسکتا تھا اور میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔

دروازے پر زور آزمائی کرنے کے دوران مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ اندر کی کنڈی ڈھیلی ڈھالی سی ہی تھی مگر باوجود اس کے کھل کے نہیں دے رہی تھی۔ اتنا ضرور ہوا تھا کہ چوکھٹ اور دروازے کے بیچ اتنا ''گیپ'' ضرور پیدا ہوگیا تھا کہ میں نے ایک ہاتھ بہ آسانی اندر داخل کر دیا تو دوسرے ہی لمحے میرا دل مسرت تلے یکبارگی زور سے دھڑکا تھا..... کیونکہ میرے ہاتھ کی انگلیوں سے اندرونی کنڈی ٹکرائی تھی۔ ابھی میں اسے اتارنے کی کوشش میں تھا کہ اچانک ایک آواز پر میں بری طرح چونکا۔

''میرو..... میرو.....''

پتا نہیں کون کسے بہ آواز بلند پکار رہا تھا۔ میں اپنا پایۂ تکمیل تک پہنچتا ہوا کام ادھورا چھوڑ کر یکلخت سیدھا کھڑا ہو گیا۔ آواز میرے دائیں جانب کی دیوار سے آئی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھا اسی طرف کو آرہا ہو۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی کنڈی اتار کر اندر گھس جاؤں مگر اب شاید اتنا وقت بھی تو نہیں رہا تھا، کیونکہ میں قریب آتے ہوئے اس شخص کے قدموں کی آواز صاف سن رہا تھا۔ وہ اب کسی بھی وقت چوکھٹ کے خلا کے سامنے سے گزرنے والا تھا..... اور وہی ہوا..... وہ ایک مسلح آدمی تھا اور حویلی کا کوئی پہرے دار ہی نظر آتا تھا۔ وہ ہنوز کسی میرو نامی آدمی کو آوازیں دیتا ہوا بڑھا جا رہا تھا۔ اسی وقت وہ اندر کو دھنسی ہوئی چوکھٹ کے سامنے نمودار ہوگیا۔ میں نے جیسے اپنی بے ترتیب پڑتی سانسیں تک روک لیں..... وہ سیدھا دیکھ رہا تھا۔ ایک ذرا سی بھی گردن اگر وہ اس طرف کو موڑ لیتا تو میں دروازے کے ساتھ چپکا کھڑا اسے نظر آجاتا.....

قسمت یاور رہی میری کہ وہ میرو کو آوازیں دیتا ہوا میرے بالکل دو فٹ کے فاصلے سے گزرتا چلا گیا مگر ٹھیک اسی وقت ایک غیر متوقع اور عجیب سی مصیبت گلے آپڑی۔ اس دروازے پر میں زور آزمائی کرنے میں مصروف تھا اس میں اچانک کھڑبڑاہٹ سی ابھری اور میرے اوسان خطا ہوگئے، یہ بات یقینی تھی کہ کوئی اندر سے دروازہ کھول رہا تھا اور کیا پتا اسے کسی بات کا شبہ ہوگیا ہو.....

''اڑے او..... جانوری.....! اِدھر ہوں میں.....''

اسی دروازے سے اندر ایک دوسرے آدمی کی صدا ابھری اور مجھے اپنی لب بام کامیابی کے ناکام جانے پر افسوس کرنے کا موقع بھی نہ ملا تھا کہ اس آدمی نے جو بلاشبہ میرو ہی ہوسکتا تھا، اچانک دروازہ کھول دیا۔

وہ مجھے دیکھ کر بری طرح ٹھٹکا اور میں اُسے..... پل کے پل ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے یوں گھورنے لگے جیسے ایک دوسرے کے لیے کسی دوسری دنیا کے باسیوں کا درجہ اختیار کر گئے ہوں..... ایسی عجیب صورتِ حال میں ہم دونوں ہی جیسے ہپناٹائز ہو گئے تھے..... اس نازک کم سنگین ترین لمحہ کے اندر ہی اندر میں نے بہ سرعت حرکت کی اور اس کی ناک پر اپنے دائیں ہاتھ کے ہتھوڑے جیسا گھونسا رسید کر دیا..... وہ اپنے حلق سے ''اوغ'' کی کریہہ ناک آواز خارج کرتا ہوا چند قدم پیچھے کو لڑکھڑایا اور پھر گر پڑا..... میں اتنے ہی موقع کو بہت جان کر غڑاپ سے اندر داخل ہوگیا اور دروازہ بھی اندر سے بند کر دیا۔

یہ تو شکر تھا کہ اس متوقع میرو نامی آدمی نے اپنے ساتھی کو اس وقت پکار کا جواب دیا تھا جب وہ میرے محتاط اندازے کے مطابق کئی قدم آگے جا چکا تھا۔ ورنہ میں ان دونوں کے درمیان سینڈوچ بن کر رہ جاتا۔ یعنی یک نہ شد دو شد والی بات ہوجاتی..... اگرچہ اب بھی پہلے والے اس کے ساتھی کی طرف سے خدشہ بدستور موجود تھا۔

مُکا لگنے کے سبب میرو کا دماغ کئی ثانیوں کے لیے ماؤف ہو چکا تھا۔ اندر کسی روشندان سے آتی روشنی میں، میں نے اندر سیمنٹ بجری کا ریختہ سا پھیلا ہوا دیکھا تھا اور وہاں اناج وغیرہ کی بوریاں بھی بے ترتیب انداز میں رکھی ہوئی نظر آرہی تھیں، میرو مُکا کھا کے انہیں بوریوں پر جا پڑا تھا۔ میں نے ایک فولادی اوزار اٹھا کر زور سے اس کی کنپٹی پر بجا دیا۔ وہ وہیں بے حس و حرکت ہوگیا۔

''میرو..... اڑے او..... میرو..... کتھے مرگیایں ادے.....''

باہر سے پھر مجھے اس کے پہلے والے ساتھی کی آواز سنائی دی۔ میں دھک سا رہ گیا۔ اس بار اس نے سندھی سرائیکی میں اپنے ساتھی میرو..... کو پکارا تھا، میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا اور کنڈی بھی چڑھا دی..... کہیں وہ اِدھر کا ہی رخ نہ کر لے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس نے میرو کی جوابی آواز نہیں سنی ہوگی۔ میں دروازے سے لگا کھڑا رہا اور ایک کان دروازے سے چپکا لیا۔ دروازے کے باہر مجھے اس..... آدمی کے قدموں کی

PkPdf.Blogspot.Com

کھچر..... کھچر سنائی دی جو دروازے کے عین قریب آ کر ایک دم تھم گئی۔ میرا دل متوقع خطرے کے باعث تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔ مگر دوسرے ہی لمحے دوبارہ جاتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی، مگر جو کچھ ہوا تھا میری پلاننڈ منصوبہ بندی کے خلاف ہی ہوا تھا۔ کیونکہ اب میرے پاس کوئی ایسا موقع نہیں بچا تھا کہ میں آرام اور تسلی کے ساتھ یہاں ڈیرا ڈال کر کچھ کرتا۔ میرو کی ڈھنڈیا... پڑ سکتی تھی۔ اس پر مستزاد اس کا ساتھی اسے پہلے سے ہی تلاش بھی کر رہا تھا۔ تاہم میں نے کچھ سوچ کر وہیں کوئی رسی کا ٹکڑا تلاش کر لیا۔ اسٹور میں ایسی اور بھی بہت سی اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے بے ہوش میرو کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیے اور..... اس کے منہ میں بھی ایک کپڑے کا ٹکڑا پھاڑ کر اس کا گولا بنا کے ٹھونس دیا۔ اس کے بعد اسے کونے میں بنے ایک اور سپاٹ سے باتھ روم سائز کے گوشے میں لے جا کر پھینک دیا۔

اسٹور کا بہ نظر غائر جائزہ لینے کے دوران مجھے اس کے کونے میں ایک دروازہ بھڑا ہوا دکھائی دیا، وہاں سے روشنی آ رہی تھی۔ میرو یقیناً اسی دروازے سے ہی اندر داخل ہوا تھا جو بلاشبہ حویلی کے اندر کسی گوشے میں کھلتا تھا۔

ایک خیال میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ میرو کو ہی تختۂ مشق بناتے ہوئے اس کے منہ سے حقیقت اگلوائی جائے مگر اس میں کئی ابہام مجھے محسوس ہوئے تھے۔ وہ بتانے سے انکار کرتا تو مجھے اس کا منہ کھلوانے کے لیے تشدد کرنا پڑتا، جان سے تو میں اسے نہیں مار سکتا تھا، دوسرے یہ کہ وہ واقعی کچھ نہیں جانتا ہو..... کیونکہ اس کا جائزہ لینے کے دوران وہ مجھے کوئی عام سا ہی ملازم ٹائپ اور غیر مسلح آدمی لگا تھا۔ جبکہ میرا اصل ٹارگٹ صالح جان تھا جو زمیندار شاہنواز خان کا مجھے کوئی قریبی دستِ راست لگتا تھا۔ وہ یقیناً ساری حقیقت جانتا ہوگا اور یہ بھی کہ شاہنواز اس وقت کہاں چھپا بیٹھا تھا نیز شکیلہ اور ارم وغیرہ کو اس بدبخت نے کہاں قید کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ طلسمِ نور ہیرے کے بارے میں بھی میں ابھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ..... شاہنواز کے ہاتھ لگا تھا یا نہیں۔

یہ سب سوچتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں اللہ سے شکیلہ کے لیے خیر و عافیت کی دعا مانگی۔

صالح جان کو ہدف بنانے سے پہلے میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ رینجرز کی ناکام ریڈ کے بعد حویلی میں کیا حالات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ شاہنواز کے سلسلے میں صالح جان نے میجر وسیم سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ جا شور و کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے گیا ہوا ہے۔

بہرطور..... میں دبے پاؤں بھڑے ہوئے دروازے کی طرف بڑھا اور اس کی چوڑی جھری سے ایک آنکھ چپکا دی۔ سامنے ایک راہداری نما راستہ تھا۔ یہ زیادہ طویل نہ تھا، بہ مشکل دس، پندرہ گام کے بعد دائیں جانب گھوم رہا تھا۔ یہاں دائیں بائیں چند کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے جو بند تھے۔ راہ داری میں مدھم سی تاریکی تھی اور وہ سنسان پڑی تھی۔ میں اسٹور نما اس کمرے کا دروازہ کھول کر راہداری میں آ گیا۔ مجھے دیکھ لیے جانے کا خدشہ دامن گیر تو تھا ہی تاہم میں نے اس سلسلے میں حد درجہ احتیاط برتی ہوئی تھی۔

اچانک میں نے کسی کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز سنی..... میں یک دم ٹھٹک کر ایک دیوار گیر چوڑے پلر کی آڑ میں ہو گیا۔

سامنے سے مجھے صالح جان آتا دکھائی دیا۔ اس کے کان سے موبائل لگا ہوا تھا اور وہ کسی سے باتیں کرتا ہوا..... ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ اپنے شکار کو دیکھتے ہی.... میرے رُواں رُواں جوش سے تھرکنے لگا۔ میں نے فوراً اسی کمرے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے اندر کی سن گن لی۔ صالح جان کو بدستور کسی سے موبائل پر باتیں کرتے ہوئے پایا۔ میں ابھی پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے کسی فیصلے پر اٹکا ہوا تھا کہ اچانک مجھے یوں لگا..... جیسے..... اندر کمرے میں صالح جان موبائل پر کسی سے باتیں کرتے کرتے ایک دم خاموش ہو گیا ہو..... میں چونکہ دروازے سے کان لگائے ہوئے تھا اسی لیے اندر کی معمولی کھڑبڑاہٹ بھی مجھے صاف سنائی دی تھی جو صالح جان کے اچانک خاموش ہو جانے کے بعد ابھری تھی..... مجھے سخت تعجب ہوا کہ آخر اندر صالح جان کے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا کہ وہ موبائل پر کسی سے باتیں کرتے کرتے ایک دم خاموش ہو گیا.....؟ اور پھر اندر ابھرنے والی وہ عجیب سی آوازیں.....؟ آخر کیا معمّا تھا یہ.....

اس کے چند لمحے بعد ہی..... میرے لیے حیرت کا ایک اور جھٹکا تیار تھا جب میں نے..... دروازے کی جھری سے اندر جھانکا تھا.....

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ